شیطان صاحب
ابن صفی

طنز و مزاح، سطر سطر مسکراہٹ

شیطان صاحب

ابن صفی

اسرار پبلی کیشنز

الکریم مارکیٹ، مین کبیر سٹریٹ

اردو بازار لاہور۔ فون: 7357022-7321970

اس ناول کے نام، مقام، کردار اور کہانی سے
تعلق رکھنے والے اداروں کے نام فرضی ہیں۔

پبلیشر............خالد سلطان
پرنٹر............یمانی پریس

سیل ڈپو: عثمان ٹریڈرز
الکریم مارکیٹ، مین کبیر سٹریٹ
اردو بازار لاہور۔ فون: 7357022-7321970

پیش لفظ

"شیطان صاحب" سے ملاقات کیجئے۔ ابن صفی کے قلم سے نکلے ہوئے طنز و مزاح سے بھرپور یہ شہ پارے یقیناً آپ کے ذوق معیار پر پورا اتریں گے۔

ابن صفی ایک شخص کا نام نہیں، جاسوسی ادب کی مکمل تاریخ کا نام ہے۔ ابن صفی وہ پہلا اور آخری ناول نگار ہے جس کی اچھوتی اور شگفتہ تحریروں نے لاکھوں افراد کا دل موہ لیا۔

جاسوسی ادب سے ہٹ کر طنز و مزاح کے میدان میں بھی ابن صفی اردو ادب کے ثقہ اور معتبر ادیبوں کی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ یہ تحریریں اس کا بین ثبوت ہیں۔ ایک صاحب کی رائے میں "اگر وہ (ابن صفی) سنجیدگی سے مزاح نگاری کی طرف متوجہ ہوتے تو آج شفیق الرحمٰن اور کرنل محمد خان کے بین بین کہیں ہوتے۔"

"ایک رات" میں ابن صفی نے مغربی تہذیب کی پروردہ سرمایہ دارانہ ذہنیت کی لعنتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ انہوں نے اس کے ایک تاریک پہلو کو اپنے مخصوص انداز میں بڑی خوبصورتی سے بے نقاب کیا ہے۔

"فرار" دھوبی کے کتے اور گدھے پر ایک خوبصورت طنزیہ تحریر آپ کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹوں کے پھول کھلا دے گی۔

"تجسس کی ناک" کے معصوم جذبے اور کچے ذہن میں امڈتے

ہوئے نت نئے سوال آپ کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیں گے۔

"حقوق و فرائض" جیسے خشک موضوع کو کس طرح ابن صفی کے قلم نے سطر سطر شگفتگی عطا کی ہے۔ یہ انہی کا حصہ ہے۔ اس میں دکھائے گئے آئینے میں کئی بڑے افسانہ نگاروں کے چہرے صاف نظر آئیں گے۔

"جگانے والے" وہ لوگ جو دوسروں کو جگانا چاہتے ہیں خود کہاں تک بیدار ہیں۔ ابن صفی کا یہ طنزیہ مضمون ایسے افراد کے دوغلے پن کی نقاب کشائی کرتا ہے۔

اگرچہ یہ مضامین ابن صفی نے طویل عرصہ قبل "طغرل فرغان" کے نام سے لکھے تھے مگر ان میں جھلکنے والا "کٹیلاپن" اور "زہریلا طنز" آپ کے لئے خوشگوار حیرت کا باعث ہو گا۔ یہ تحریریں پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے موجودہ دور کے لئے ہی لکھی گئی ہوں۔ ادیب کی خوبی ہی یہ ہوتی ہے کہ وہ آنے والے دنوں کو محسوس کرے۔ ابن صفی میں یہ خوبی بدرجہ اتم موجود تھی۔

اور آخر میں ابن صفی کی شاعری کا انتخاب ـــ ابن صفی کی شخصیت کا ایک اور لطیف اور نازک رخ، جو ذہنوں کے کئی نئے دریچے وا کرنے کا باعث بنے گا۔ یہ ابن صفی کی قلبی وارداتیں ہیں جو آپ کے شعری ذوق کی تسکین کا باعث بنیں گی۔

خالد سلطان

عنوانات

ایک رات

"دیکھو دیکھو۔۔۔ وہ رہا۔۔۔ جانے نہ پائے۔۔۔ ابے مار"۔

رائفل سے شعلہ نکلا...... فائر کی آواز آئی اور وہ چار دیواری پھلانگ کر نکل بھاگا۔

"لاحول ولا قوۃ ...... پھر نکل گیا...... ابے تو تو اندھا ہے اندھا" خان بہادر صاحب گرجے۔

نصیرا بھنا کر رہ گیا...... تمیں مار خاں بنتے ہیں تو خود ہی کیوں نہیں مار دیتے مجھے کیوں رائفل تھما دیتے ہیں۔

"مگر سرکار وہ سامنے کب تھا"۔

"ہاں ہاں وہ سامنے بھی آئے گا۔ جیسے رائفل کی گولی نہیں پٹاخہ ہے۔ الو کے پٹھے مت بکو" سرکار نے جھلا کر کہا اور الو کے پٹھے نے سر جھکا لیا۔

"میں کہے دیتا ہوں آج اس سالے کو ختم ہو جانا چاہئے ورنہ تمہاری خیر نہیں"۔ خان بہادر صاحب نے پورٹیکو کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔

نصیرا کا دل چاہا کہ برآمدے میں بیٹھی ہوئی کتھئی رنگ کی اسپینیل کتیا ہی کو ختم کر دے جس کی وجہ سے وہ ایک ہفتہ سے گالیاں ہی سنتا چلا آرہا تھا۔...... اس کی کئی راتیں اس کی وجہ سے خراب ہو چکی تھیں۔

......اور آج رات بھی چین سے سونا اسے دشوار ہی نظر آرہا تھا۔ نصیرا پام کے

بڑے گملے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ ..... خان بہادر صاحب بر آمدے میں بیٹھے کتیا کی پیٹھ سہلا رہے تھے۔ ..... نومبر کی رات تھی۔ دو دن پہلے بارش ہو چکی تھی۔ نصیرا کو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کے کان بے جان ہو گئے ہوں۔ ..... خان بہادر کے حکم سے اس نے آج پھٹا ہوا مفلر بھی اپنے کانوں پر نہ لپیٹا تھا تاکہ آہٹ صاف سنائی دے ..... سردی سے بچنے کے لئے اس نے ایک بیڑی سلگائی اور لمبے لمبے کش لینے لگا.....۔

"ابے او گدھے کے بچے" خان بہادر صاحب نے بر آمدے سے للکار کر کہا "اب تو ضرور آئے گا۔ ..... بیڑی بجھا دے ..... اور وہاں سے ہٹ کر مالتی کی جھاڑیوں کے پیچھے دبک جا....."

نصیرا نے دل ہی دل میں گالیاں دیتے ہوئے جلتی ہوئی بیڑی زمین پر رگڑ دی اور مالتی کی جھاڑیوں کے پیچھے چلا گیا..... یہاں تو ٹیک لگانے کی بھی جگہ نہ تھی..... اور پھر سردی۔ سرسبز جھاڑیوں کی خنکی سیلی ہوئی زمین کی ٹھنڈک ..... سر پر کھلا آسمان ..... وہ رائفل کو گود میں رکھ کر اکڑوں بیٹھ گیا..... رائفل کی ٹھنڈی ٹھنڈی نال اس کی رانوں میں چپک کر رہ گئی۔ اس نے اپنے برسوں کے پرانے گرم کوٹ کا کالر کانوں کے برابر اٹھا کر دونوں ہاتھوں سے دبا لیا۔

خان بہادر صاحب نے کسی سے کہا "ذرا میرا کمبل تو دے جانا..... اور وہ تکئے کے نیچے کتاب ہو گی اسے بھی لیتے آنا"۔

ہاں سالے تم تو قبر ہی میں چین سے سوؤ گے۔ نصیرا سوچنے لگا..... اسے نیند نہ جانے کیوں نہیں آتی۔ ڈاکٹر پر ڈاکٹر آتے ہیں۔ کوئی اللہ کا بندہ زہر نہیں پلا دیتا..... سو جائے چین سے ..... بڑے آدمیوں کی بھی بڑی باتیں ہوتی ہیں ..... بیمار ہیں..... کیا بیمار ہیں؟..... نیند نہیں آتی ..... یہاں کھانستے کھانستے مر جاؤ..... بخار میں جلتے جلتے کباب ہو

جاؤ۔ مگر کوئی یہ نہ کہے گا کہ بیمار ہو..... کچھ نہیں زکامی حرارت ہے..... کھٹائی مٹھائی کھائی ہو گی اسی لئے کھانسی آ رہی ہے۔ ..... کوئی خاص بات نہیں۔ بات تمہاری کھٹائی مٹھائی کی ..... سالا سر پر سوار ہے ..... بیڑی بھی بجھوا دی..... افوہ کتنی سردی ہے..... وہ اور سکڑ گیا..........

سڑک پر کتوں کے دوڑنے کی آواز آئی ..... اور اس نے رائفل سنبھالی ..... بر آمدے میں بیٹھی ہوئی کتیا "چوں چوں" کرنے لگی۔ خان بہادر صاحب کی آواز آئی "لوسی ــــ لوسی"

کتیا اور زور سے "چوں چوں" کرنے لگی..........

نصیرا کے ہونٹوں پر گالی آتے آتے رہ گئی..... وہ سوچنے لگا ــــ ہاں سالے دلاسہ دیئے جاؤ اپنی نانی کو..... اگر آج بھی اس سالے پر ہاتھ نہ لگا تو کل زہر ہی پلا دوں گا تمہاری چہیتی کو چاہے پھر جان ہی کیوں نہ چلی جائے ــــ وہ تو بابا کی وصیت یاد آ جاتی ہے ورنہ کبھی کا اس نوکری پر لات مار کر چل دیتا۔ کام بن جائے تو انعام نہیں، بگڑ جائے تو گالیاں کھاؤ..........

"ابے سو رہا ہے کیا" ؟ خانصاحب کی گرجدار آواز سنائی دی۔

"نہیں تو" نصیر سنبھل کر بولا۔

"نہیں تو کے بچے ..... ذرا ہوشیاری سے"۔

اس کا دل چاہا کہ کھڑے ہو کر خان بہادر کو رائفل کھینچ مارے ..... اسے اپنے آباؤ اجداد پر غصہ آ گیا جو خان بہادر کے آباؤ اجداد کے ٹکڑوں پر پل کر دائمی غلامی کی بنیاد ڈال گئے تھے۔ اسے اپنے باپ کے الفاظ یاد آ گئے جو اس نے مرتے وقت کہے تھے، "بیٹا اس گھر کے ہمیشہ وفادار رہنا ہمیں ہمارے باپ دادا کی ہڈیاں پلی ہیں۔ کبھی خود کو تنخواہ دار نوکر نہ سمجھنا..... تم اس گھر کے پالک ہو..... ہم اس گھر کے پالک ہیں

...... کلو ابھی تو ڈپٹی صاحب کے گھر کا پٹک ہے ...... چھایا ہوا ہے سارے گھر پر کیا مجال کوئی چوں تو کرے ...... نوابوں کی طرح گھر سے نکلتا ہے ...... ایک ہم ہیں ...... نہ پیٹ بھر کھانا نہ بدن پر لتا ...... سردی میں بیٹھے سٹک رہے ہیں ...... اس پر سے گالیوں کی بوچھاڑ ...... مرنے والے مرگئے اور یہاں وبال چھوڑ گئے ...... بات تیری وصیت کی ...... کہیں اور جاکر کما کھائیں گے ...... تھوڑا بہت لکھ پڑھ لیتے ہیں کسی چکی گھر پر منشی گیری ہی کر لیں گے ...... لوگ منشی جی تو کہیں گے ...... یہاں تو بس او نصیرا ...... ابے او نصیرا ...... !

"ابے پھر بیڑی پینے لگا کیا؟" خان بہادر صاحب چلائے۔

"نہیں تو" اس نے کھکار کر کہا۔

"پھر وہی نہیں تو" خان بہادر صاحب جھلا کر بولے "ابے تجھے بات کرنا کب آئے گا"

"جب تم جہنم رسید ہو جاؤ گے"۔ نصیرا نے دل میں کہا اور دانت پیسنے لگا ...... ناک میں دم کر رکھا ہے ...... سردی کے مارے جان نکلی جارہی ہے ...... اور اس پر سے خواہ مخواہ کی ڈانٹ پھٹکار ...... نہ جانے کب تک یوں ہی بیٹھا رہنا پڑے ...... بیڑی بھی نہیں پینے دیتا ...... کیا کیا جائے ...... دفعتاً ایک خیال اس کے ذہن میں چمک اٹھا۔

"سرکار برآمدے میں جو بتی جل رہی ہے کہیں اس سے بھڑک نہ جائے اور ایک فائر بھی ہو چکا ہے" نصیرا نے جھاڑیوں سے سر ابھار کر کہا۔

"اچھا! ...... اب مجھے منطق پڑھانے چلے ہیں" خان بہادر نے گرج کر کہا "لو بتی تو بجھائے دیتا ہوں مگر میں یہاں سے ہٹ نہیں سکتا ...... کام چور کہیں کا"۔

"ارے تم یہیں پر دفن ہو جاؤ ...... شیطان کے بچے" اس نے دل میں کہا اور جھنجھلاہٹ میں اپنے بال نوچنے لگا۔ برآمدے میں اندھیرا ہو گیا اور کتیا پھر "چوں چوں پیاؤں پیاؤں ...... چوں چوں" کرنے لگی۔

"لوسی۔ لوسی" خان بہادر صاحب نے چمکارا ....

بوڑھا ہو گیا مگر عقل نہ آئی ...... وہ سوچنے لگا ...... ارے چلائے گی نہیں تو وہ سالا آئے گا کیسے ...... ابھی کہہ دوں تو الف ہو جائے ....

واقعی یہ کتیا اس کے لئے ایک مستقل عذاب ہو کر رہ گئی تھی ...... اس کا بس چلتا تو پہلے اسی کو گولی مار دیتا ...... خان بہادر صاحب نے اسپنیئل کا پورا جوڑا خریدا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد کتا ایک حادثے کا شکار ہو کر چل بسا اور کتیا اکیلی رہ گئی ...... خان بہادر صاحب چاہتے تھے کہ کہیں سے کوئی نجیب الطرفین قسم کا اسپنیئل مل جائے تو خرید لیں ورنہ قرب و جوار کے دیسی آوارہ کتوں کی بن آئے گی۔ ...... لیکن انھیں کوئی نجیب الطرفین کتا نہ مل سکا اور کاتک شروع ہو گیا ...... ہوا وہی جس کا ڈر تھا ...... کئی کتے ان کے پائیں باغ کی چہار دیواری کے گرد منڈلانے لگے ...... ان میں سے ایک جو بہت ہی مشاق قسم کا عاشق معلوم ہوتا تھا اسپنیئل کتیا کا دل جیتنے میں کامیاب ہو گیا ...... شروع شروع میں سڑک پر کھڑے ہو کر فلمی گانے گائے گئے ...... اس کے بعد آنکھوں ہی آنکھوں میں پیام و سلام ہوئے اور پھر کتیا برآمدے سے اٹھ کر پھاٹک تک آنے لگی ...... یہ دیکھ کر خان بہادر صاحب کو بہت تشویش ہوئی اور انہوں نے حکم دے دیا کہ کسی وقت پھاٹک کو کھلا نہ رہنے دیا جائے ...... مگر وہ تھا لوہے کی سلاخوں کا پھاٹک ...... اور سلاخیں اتنے فاصلے پر جڑی گئی تھیں کہ دونوں ان میں سے منہ نکال کر ایک دوسرے کو بہ آسانی سونگھ سکتے تھے ...... خان بہادر صاحب اچھی طرح جانتے تھے کہ سونگھنے سے محبت بڑھ جاتی ہے ...... انہوں نے کتیا کو باندھ کر رکھنا شروع کیا۔ مگر

کتیا نے چیخ چیخ کر پوری کوٹھی سر پر اٹھالی۔ مجبوراً پھر کھول دینا پڑا اور پھر دونوں کا معاشقہ شروع ہو گیا..... خان بہادر صاحب دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتے ..... انہیں اپنی کتیا سے ایسی امید نہ تھی..... مگر کتیا کا اس میں کیا قصور..... وہ تو اس کمبخت کتے ہی کو حفظ و مراتب کا خیال رکھنا چاہئے تھا..... کہاں اسپنیل کتیا اور کہاں دیسی دم کٹا کتا..... نہ دم ہلانے کی تمیز اور نہ بھونکنے کا سلیقہ..... بے ہنگم..... جغادری..... بدتمیز..... بدسلیقہ۔ بھونکتا تو ایسی جھنکار پیدا ہوتی ہے جیسے پھیپھڑوں میں منوں بلغم اکٹھا ہو۔ جب کٹی ہوئی دم ہلاتا تو ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی کسی کو ٹھینگا دکھا رہا ہو۔ .....

کچھ دنوں تک دور ہی سے رومان بازی ہوتی رہی۔ آخر کار ایک دن کتے کو جوش آ ہی گیا..... ممکن ہے اسپنیل کتیا نے غیرت دلائی ہو..... رات کا وقت تھا خان بہادر صاحب برآمدے میں کھڑے کسی مہمان کو رخصت کر رہے تھے..... انہوں نے کتے کو چھ فٹ اونچی دیوار پھلانگ کر اندر آتے دیکھا..... گھبراہٹ میں دوڑ پڑے..... ٹھوکر کھائی اور سیڑھیوں سے لڑھک کر پورٹیکو میں آ رہے..... کتے نے چھلانگ لگائی اور نکل بھاگا۔ .....

لوگوں نے لپک کر خان بہادر صاحب کو اٹھایا۔ زیادہ چوٹ نہیں آئی تھی۔ صرف معمولی خراشیں تھیں..... اگر چوٹ بھی آتی تو انہیں پرواہ نہ ہوتی..... کیونکہ معاملہ براہ راست اسپنیل کتیا کا تھا..... اگر خدانخواستہ کتیا "خراب" ہو جاتی تو کیا ہوتا..... وہ تو خدا کو کچھ اچھا ہی کرنا منظور تھا جبھی تو ان کی نظر پڑ گئی ورنہ انہیں کیا معلوم ہوتا کہ رات کو پائیں باغ میں کیا ہوتا ہے۔ انہوں نے فوراً طے کر لیا کہ احتیاطی تدابیر شروع کر دی جائیں..... نصیرا کو رائفل دی گئی اور سمجھا دیا گیا کہ جیسے ہی کتا کمپاؤنڈ میں داخل ہو گولی مار دی جائے۔ کتا ایک ہی کائیاں تھا کمپاؤنڈ میں ضرور آتا مگر رائفل کی زد

پر نہ آتا۔ دو ایک بار فائر ہو جانے پر وہ اور چوکنا رہنے لگا تھا۔ مگر تھا بڑا بے جگر..... کوئی اور کتا ہوتا تو ایک ہی بار رائفل کی آواز سن کر ادھر کا رخ نہ کرتا۔ مگر واہ رے کتے عاشق ہو تو ایسا ہو..... کیا مجال کہ کسی رات ناغہ ہو جائے..... اور پھر ایک بار نہیں چار چار چھ چھ بار۔ ابھی فائر ہوا نکل بھاگا..... تھوڑی دیر بعد پھر موجود..... نہ ہوا خان بہادر صاحب کے گھر میں کوئی اہل دل۔ ورنہ اس کتے سے سبق لیتا..... ایک ہم انسان ہیں کہ جوتوں کے ڈر سے "طواف کوچہ جاناں" سے توبہ کر لیتے ہیں..... ایک وہ کتا تھا کہ گولیوں سے بھی خوف نہیں کھاتا تھا۔ اسی لئے تو گورے لوگ کتوں کو اس قدر عزیز رکھتے ہیں اور کالے آدمیوں سے نفرت کرتے ہیں۔ کالے آدمی جو ایک اسپنیل کتیا کے لئے ایک دیسی کتے کا خون نہیں کر سکتے..... کالے آدمی جنہیں سردی لگتی ہے..... کالے آدمی جنہیں ایک مہذب کتیا کے لئے اپنی راتوں کا خراب ہونا کھل جاتا ہے..... خان بہادر صاحب بالکل کالے نہ تھے۔ اسی لئے تو وہ خان بہادر تھے..... کالا آدمی قطعی بہادر نہیں ہوتا..... چاہے خان ہی کیوں نہ ہو..... خان بہادر کالے نہیں تھے انہیں اسپنیل کتیا عزیز تھی اور دیسی کتوں سے نفرت کرتے تھے۔ دیسی کتے! جنہیں نہ بھونکنے کا سلیقہ نہ دم ہلانے کی تمیز..... اور یہ دیسی کتا تو ان کی اچھی نسل کی کتیا کو "خراب" کر دینے پر تلا ہوا تھا..... بالکل ناقابل برداشت..... خان بہادر صاحب اپنے غم و غصہ کے اظہار کے سلسلے میں قطعی حق بجانب تھے..... یہ اور بات ہے کہ خود کتیا کے دل میں باغیانہ خیالات جنم لے رہے ہوں..... وہ اس "سماجی" بندش پر دل ہی دل میں جھلا رہی ہو..... خان بہادر صاحب کی "جاگیردارانہ ذہنیت" پر تاؤ کھا رہی ہو حالانکہ اسے تاؤ کے بجائے صرف پلاؤ کھانا چاہئے..... کیونکہ پلاؤ زندگی کی سب سے بڑی ضرورت ہے..... اگر آدمی کو پلاؤ نہ میسر ہو تو کتیا پالنے کا خیال ہی نہ پیدا ہو سکے۔ .....

نصیرا اونگھتا رہا..... اور اونگھنے کے علاوہ چارہ ہی کیا تھا..... وہ اتنی "اونچی" باتیں بھی تو نہ سوچ سکتا تھا کہ سوچ ہی سوچ کر بدن میں کچھ گرمی آتی..... "اونچی" باتیں سوچ سکتا تو سردی میں کتا مارنے کے بجائے میری طرح لحاف میں گھس کر افسانہ لکھتا اور فرائیڈ کو مغربی افسانہ نگار سمجھ کر گالیاں دیتا..... محض اس لئے کہ بہت سے لکھنے والے اسے یہی سمجھ کر گالیاں دیتے ہیں۔ .....

تو نصیرا اونگھتا رہا۔

دفعتاً خان بہادر صاحب کو کھانسی آئی..... غالباً وہ بھی اونگھ رہے تھے۔ کیونکہ کھانسی کے بعد ہی انہوں نے نصیرا کو للکارا "ابے سو رہا ہے کیا؟"

"نہیں تو" نصیرا چونک کر رندھی ہوئی آواز میں بولا.....

"آج مار ہی لے اسے..... ورنہ شامت آ جائے گی تیری"۔

نصیرا خاموش رہا..... جواب ہی کیا دیتا..... دراصل اس کی یہی ادا خان بہادر صاحب کو بے حد ناگوار تھی..... وہ جواب چاہتے تھے اپنی باتوں کا..... انہیں نصیرا کا یہ رویہ بالکل ایسا معلوم ہوتا جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا ہو "جواب جاہلاں باشد خاموشی"..... حالانکہ خان بہادر صاحب جاہل نہیں تھے۔ انہوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی تھی اور کچھ عرصہ تک جرمنی میں بھی رہ چکے تھے..... انہوں نے مغربی ممالک کے نوکر بھی دیکھے تھے..... نہایت چاق و چوبند ..... زندہ دل حاضر جواب..... تیز جواب..... ایک دن پیرس کے ہوٹل میں ناشتہ کر رہے تھے..... ویٹر سے کسی مشہور ہوٹل کے متعلق پوچھ بیٹھے..... مسکرا کر بولا "معاف کیجئے گا! آپ کا سوال انتہائی احمقانہ ہے"..... خان بہادر صاحب کو فوراً خیال آ گیا کہ انہیں یہ چیز پسند تھی۔..... جہاں تک ان کا اور ان کے گھر والوں کا تعلق تھا وہ قریب قریب بالکل مغربی تھے..... مگر افسوس انہیں مغربی طرز کے نوکر نہ مل

سکے..... ہندوستان میں مغربی نوکر کا خیال احمقانہ ہی نہیں بلکہ قطعی غیر مغربی تھا کیونکہ یہاں مغربی قسم کی چیز صرف کلکٹر یا کمشنری ہو سکتی تھی۔ للذا وہ مغربی نہیں بلکہ وہ مغربی طرز کا نوکر چاہتے تھے۔ لیکن یہ چیز بھی ناممکن تھی کیونکہ مغربی طرز کے لوگ "نوکری" کے بجائے کلرکی کے قائل ہیں۔ بہرحال ان کی یہ تمنا کبھی پوری نہ ہو سکی ..... غالباً وہ نصیرا سے بھی مغربی طرز کی بے تکلفی چاہتے تھے..... اور نصیرا کو ڈر تھا کہ کہیں واقعی وہ کسی دن بے تکلفی ہی پر نہ آمادہ ہو جائے۔ اس وقت کی سردی اور خان بہادر صاحب کی نکتہ چینیوں نے اسے بہت زیادہ برہم کر دیا تھا..... اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اسی رائفل سے اپنا ہی قصہ پاک کر ڈالے۔

خان بہادر صاحب کھانستے کھانستے اچانک رک گئے غالباً انہوں نے سفید کتے کو چہار دیواری پھلانگ کر آتے دیکھ لیا تھا..... نصیرا نے آہستہ سے رائفل سیدھی کی ..... نشانہ لیا..... اور فائر کی آواز کے ساتھ ہی کتے کی ہیبت ناک چیخ سنائی دی۔

"کیا ہوا؟" خان بہادر صاحب چیخے۔

"مار لیا" نصیرا کی آواز میں بے شمار مسرتوں کی کپکپاہٹ تھی۔.....

خان بہادر صاحب نے برآمدے کی بجلی جلائی اور کمپاؤنڈ کی طرف لپکے..... تڑپتے ہوئے کتے نے آخری جست کی اور منہ پھیلا کر دم توڑ دیا۔

"سالے نہیں تو" خان بہادر صاحب نے کہا اور ٹارچ کی روشنی میں جھک کر گولی کا نشان دیکھنے لگے۔.....

کسی نے پھاٹک ہلایا۔.....

خان صاحب نے نصیرا سے پوچھا "کون ہے؟"

"بی بی جی ہوں گی..... شاید سینما دیکھنے گئی تھیں" نصیرا نے رائفل کی نال سے کارتوس نکالتے ہوئے جواب دیا.....۔

"ابے تو جا کر کھولتا کیوں نہیں" ۔ خان صاحب گرجے۔

پھاٹک کھلا ...... خان بہادر کی صاحب زادی کسی مرد کے ساتھ کمپاؤنڈ میں داخل ہوئیں۔

"دیکھا شمی ...... آج مار ہی لیا اسے" خان بہادر صاحب یہ کہتے ہوئے ادھر لپکے۔

"اوہ ...... ڈیڈی! یہ ہیں مسٹر رشید مس فریدہ کے بھائی میرے کلاس فیلو" شمی نے اجنبی کی طرف دیکھ کر کہا۔

نصیرا نے رائفل سیدھی کر لی ...... اسے ایسا معلوم ہوا جیسے خان بہادر صاحب کہیں گے۔

"ابے مار" ___ مگر خان بہادر صاحب نے قدرے جھک کر ہاتھ ملاتے وقت صرف دانت نکال دیئے۔

شیطان صاحب

زیدان صاحب نے لائبریری میں مشاعرہ جما رکھا تھا۔ اس لئے مجبوراً مجھے ڈرائنگ روم کا رخ کرنا پڑا۔ میں آج کسی سے ملنا نہ چاہتا تھا۔ نوکروں کو تاکید کر دی تھی کہ وہ ہر آنے والے کو بحسن و خوبی ٹال دیں...... بات دراصل یہ تھی کہ میں "ڈانٹے کا جنہم" پڑھ رہا تھا۔ مجھے افسوس تھا کہ دنیا کے جھمیلوں میں پڑ کر ایک ایسی فنکارانہ تخلیق سے اب تک محروم رہا۔ لہٰذا میں نے اتفاقاً یہ طے کر لیا تھا کہ جب تک کتاب ختم نہ ہو جائے گی دنیا والوں کی صورت نہ دیکھوں گا ___ شعرائے کرام کی آوازیں ڈرائنگ روم تک پہنچ رہی تھیں ...... تھوڑی دیر تک تو جھنجھلاتا رہا، مگر کتاب کھولتے ہی ایسا محسوس ہونے لگا جیسے سب کے سب "ڈانٹے کے جنہم" میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیئے گئے ہوں۔ نہ جانے کب تک پڑھتا رہا...... اچانک ایک عدد زوردار آداب عرض سے چونک پڑا ...... ڈرائنگ روم میں ایک اجنبی کا اتنا پراسرار داخلہ میرے لئے اگر موت نہیں تو کم از کم غش کھا جانے کا پیغام ضرور تھا۔ میں جھنجھلا کر کھڑا ہو گیا، قبل اس کے کہ میرا ہاتھ آنے والے کی گردن میں ہو میری نظریں اس کے سر پر ترچھی رکھی ہوئی فیلٹ ہیٹ پر پڑیں...... مجھ پر لرزہ طاری ہو گیا ...... ڈرائنگ روم میں ایک ایسا اجنبی جس نے ہیٹ نہ اتاری ہو بہت ہی بھیانک چیز تھی ...... جب میں آکسفورڈ میں تھا تو میں نے ایسی بدارواح کے بہت سے قصے سنے تھے۔ جنہیں اس وقت یاد کر کے میرا دل ڈوبنے لگا تھا۔

"معاف کیجئے گا، میں نے آپ کو پہچانا نہیں" میں نے کانپتے ہوئے بدقت کہا۔

دوسرے لمحے میں اجنبی کا ملاقاتی کارڈ میرے ہاتھ میں تھا۔ جس پر سنہری حرفوں میں لکھا ہوا تھا۔ "شیطان"

"لاحول ولا ......"

"ٹھہرئیے ٹھہرئیے" وہ گھبرا کر بولا "یہ کیا بدمذاقی؟ میں اس وقت ایک مغربی طرز کے ملاقاتی کمرے میں ہوں۔ کسی خانقاہ یا مدرسہ میں نہیں۔ میں تو آپ کو ترقی پسند سمجھا تھا۔"

"میں شرمندہ ہوں......"

وہ نہایت اطمینان کے ساتھ اجازت طلب کئے بغیر صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔

"کون سی کتاب پڑھ رہے تھے؟" اس نے کتاب اٹھاتے ہوئے کہا۔ "اوہ ......" "ڈانٹے کا جہنم؟" اس نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا کہ مجھے پھر شرمندہ ہو جانا پڑا۔

"اس سے زیادہ لچر کتاب آج تک لکھی ہی نہیں گئی" وہ اپنی ہیٹ فرش پر رکھتے ہوئے بولا۔

میں نے چاہا کہ الجھ پڑوں مگر اس کی آنکھ سے نکلتی ہوئی ایک عجیب قسم کی برقی رو نے میرا گلا گھونٹ دیا۔ میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے محسوس کیا کہ میرا حلق بھی خشک ہو چکا ہے...... ہونٹ کانپے مگر آواز نہ نکل سکی۔

"جھک مارا ہے ڈانٹے نے" وہ دوبارہ بولا۔ "محض اپنی محبوبہ کو جنت میں دکھانے کے لئے اتنا بکھیڑا کیا ہے"

بات تو بڑے پتے کی کہی ظالم نے ...... دل ہی دل میں قائل ہو جانا پڑا۔

"مگر ـــ مگر ـــ یقین نہیں آتا کہ ـــ آپ ـــ؟" میں نے ہکلا کر ملاقاتی کارڈ کی طرف اشارہ کیا۔

"یقین تو آپ کی ماما حوا اور بابا آدم کو بھی نہیں آتا تھا" اس نے مسکرا کر کہا۔

"مگر......"

"جی ہاں۔ میں سمجھتا ہوں ...... غالباً آپ کو میرے جسم پر ریشمی سوٹ گراں گزار رہا ہے۔"

"جی نہیں"

"فرنچ کٹ ڈاڑھی شبہ میں ڈال رہی ہے؟" اس نے استفہامیہ انداز میں کہا۔

"یہ بھی نہیں"

"پھر؟"

"آپ کے پیر"

"کیا مطلب؟"

"بچپن میں سنا کرتا تھا کہ آپ کے پنجے پیچھے ہوتے ہیں اور ایڑیاں آگے"

"بکواس ہے" اس نے آہستہ سے کہا۔ "آپ حضرات کی نانیوں اور دادیوں نے مجھے خوب دل کھول کر بدنام کیا ہے۔"

"ارے! ...... آپ کو کیونکر معلوم ہوا۔" میں نے حیرت سے کہا۔

"دراصل یہ بات مجھے نانی جان ہی سے معلوم ہوئی تھی۔"

"آپ پھر بھول رہے ہیں کہ میں شیطان ہوں ـــ" شیطان صاحب نے

زوردار قہقہہ لگایا۔

"سگریٹ" میں نے سگریٹ کیس بڑھایا۔

"نو تھینکس۔ میں مصری سگریٹ پیتا ہوں" یہ کہہ کر شیطان صاحب نے اپنے سگریٹ کیس سے سگریٹ نکالا اور ہونٹوں میں دبا کر سلگاتے ہوئے بولے۔

"اس سگریٹ سے بہتر دنیا میں کوئی اور سگریٹ ہی نہیں"۔

"ممکن ہے" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے لاپرواہی سے جواب دیا۔

"ایک بات عرض کروں۔" میں نے کہا۔

"فرمایئے۔ فرمایئے"۔

"مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لوگوں نے خواہ مخواہ آپ کو بدنام کر رکھا ہے۔" میں نے کہا "آپ تو بہت اچھے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔"

"خیر آدمی تو نہ بنایئے مجھے"۔ وہ بیزاری سے بولے۔ "اگر اچھا نہیں تو اتنا برا بھی نہیں ہوں۔ میں نے ابھی تک بہت ہی ٹھوس قسم کی اصلاحی خدمات انجام دی ہیں۔ یہ بڑی بڑی شاندار ملیں ــــ لمبی چوڑی کشادہ سڑکیں ــــ یہ جگمگاتی ہوئی راتیں ــــ یہ تہذیب۔ یہ تمدن ــــ یہ سب میری کاوشوں کا ہی نتیجہ ہیں"۔

میں نے قائل ہو جانے والے انداز میں سر ہلایا۔

"بھائی آپ افسانے بہت اچھے لکھ لیتے ہیں۔" شیطان صاحب نے یک لخت گفتگو کا رنگ بدل دیا۔

"ذرہ نوازی آپ کی۔" میں نے شرما کر کہا۔

"بکواس ہے"۔ شیطان صاحب جھنجھلائے۔

"جی ــــ!"

"اگر خاکساری کا یہی حال رہا تو کوئی ٹکے کو بھی نہ پوچھے گا۔ اگر کامیاب قسم

کے شاعر یا ادیب بنا چاہتے ہوں تو انانیت پیدا کیجئے ...... کسی کو خاطر میں نہ لایئے ...... سوچئے کم لکھئے زیادہ ...... بات کم کیجئے ...... گالیاں زیادہ بکئے ...... اگر دوسرے رسائل آپ کے مضامین نہ چھاپیں تو خود ایک عدد رسالہ نکال ڈالئے ــــ ٹھوس قسم کا بلند پایہ ادبی رسالہ ــــ تجارت نہ کیجئے ادب کی خدمت کیجئے ...... کیا سمجھے؟"

"چائے منگواؤں آپ کے لئے"۔ میں نے مرعوب ہو کر کہا۔

"جی نہیں ــــ شکریہ" ہاں تو میں یہ کہنے والا تھا کہ آپ بڑے بدمذاق معلوم ہوتے ہیں، آپ کے گھر میں مشاعرہ ہو رہا ہے اور آپ ڈانٹنے سے سر مار رہے ہیں ...... آپ کے بھائی زیدان بڑے عمدہ آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ کیا کیا شاعر جمع کئے ہیں۔ میں ابھی لائبریری ہی سے آ رہا ہوں۔ ایک نہایت خوب رو لڑکا لہک لہک کر پڑھ رہا تھا۔

ہے تری چشم کرم بزم امارت کی مکین
تو غریب کا خدا ہرگز نہیں ہرگز نہیں

کیا شعر کہا ہے ظالم نے۔ نہ ہوا بہادر شاہ کا زمانہ ورنہ اسے جگت استاد بنوا دیتا ...... خیر، ہاں تو مجھے آپ کا نام بالکل پسند نہیں ...... آخر یہ طغرل فرغان کیا بلا ہے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ اگر آپ نے میری ہدایت پر عمل کیا تو خود بخود آپ طغرل شیطان ہو جائیں گے ...... دیکھئے یہ اعزاز پہلے پہل صرف آپ کو عطا کر رہا ہوں ورنہ میں نے خود اپنی زبان سے آج تک کسی کو شیطان نہیں کہا۔ وجہ یہ ہے کہ میں اپنے حریف کا وجود نہیں برداشت کر سکتا۔ مجھے فخر ہے کہ اس وسیع کائنات میں صرف میں ہی ایک شیطان ہوں ...... آج تک کسی نے میرا نام اپنانے کی ہمت نہیں کی"۔

اتنا کہہ کر شیطان صاحب نے سامنے والی تصویر پر نگاہیں جما دیں۔ میری آنکھوں میں عقیدت کے آنسو ناچ رہے تھے۔ میں نے ہچکی روکتے ہوئے گلوگیر

آواز میں کہا، "پیرو مرشد ایک بات ......"

"آرڈر ...... آرڈر" شیطان صاحب زور سے چیخے اور میں سہم کر ان کی صورت تکنے لگا۔

"اب ہم پیرو مرشد نہیں ہیں۔" شیطان صاحب چٹکیوں سے پتلون کی کریز درست کرتے ہوئے بولے۔ "یور آنر کہئے یور آنر"

میں پھر شرمندہ ہو گیا۔

"بات دراصل یہ ہے" میں ہکلایا۔ "میں ـــ میں ـــ یہ پوچھنا چاہتا تھا۔ کک ـــ کک ـــ کبھی آپ نے کسی سے مم۔ مم۔ مم۔ محبت بھی کی ہے۔"

شیطان صاحب نے مجھے بری طرح گھور کر دیکھا۔

"اناڑی ہی سمجھتے ہیں کیا آپ مجھے"۔ شیطان صاحب تیزی سے بولے، "دن رات مجھے اس وسیع کائنات کی چولیں ملانی پڑتی ہیں...... آپ نے مجھے افلوتی سمجھ رکھا ہے کیا؟ اگر میں محبت وجت کے جھگڑے میں پڑ جاؤں تو یہ دنیا ایک دن بھی نہ چل سکے ...... ہاں میں محبت کرنا سکھاتا ضرور ہوں...... کیا سمجھے...... بھئی مجھے تھوڑا بہت ہر ایک کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اگر میں محبت کرنا نہ سکھاؤں تو یہ بیچارے شمس العلماء کیا کھائیں"۔

شیطان صاحب نے رک کر دوسرا سگریٹ سلگایا اور ایک مجھے بھی پیش کیا...... سگریٹ نہایت نفیس تھا۔ میرا دل چاہا کہ بے اختیار شیطان صاحب کے قدموں پر گر کر جان بحق تسلیم ہو جاؤں ...... ہر کش پر عقیدتوں کا جوش بتدریج بڑھ رہا تھا۔

"آپ تو خوب خوب سیر سپاٹے کرتے ہونگے۔" میں نے سگریٹ کا طویل کش لے کر کہا۔

شیطان صاحب اچانک کچھ مضمحل ہو گئے۔ ٹھنڈی سانس لے کر آہستہ آہستہ

بولے۔

"آپ کا خیال غلط ہے۔" میں ۱۸۵۷ء سے ہندوستان ہی میں مقیم ہوں ...... ہندوستان سے میری مراد نیم براعظم ہے۔ ...... ۱۸۵۷ء کے غدر میں پہلی بار میرے دل میں بٹوارے کا خیال پیدا ہوا تھا۔ شکر ہے کہ آج میں دونوں ممالک کو خوش حال دیکھ رہا ہوں ...... ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ ۱۸۵۷ء سے لے کر اب تک ہندوستان میں مقیم ہوں۔ اس درمیان میں مجھے صرف دوبار مغربی ممالک کی طرف جانا پڑا۔ ایک بار ۱۹۱۴ء میں گیا تھا اور دوسری بار ۱۹۳۹ء میں ـــ ۱۹۱۴ء کے بعد جب ہندوستان واپس آیا تو مجھے اپنی غیر حاضری پر سخت تاسف ہوا...... اتنے عرصہ کی محنتوں پر پانی پڑ گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ہندو مسلم شانہ سے شانہ ملائے جلیان والا باغ کی طرف مارچ کر رہے ہیں۔ قریب تھا کہ غش کھا جاؤں۔ جلیان والا باغ میں بڑی بڑی مشین گنیں دیکھ کر قدرے اطمینان ہوا...... مگر صاحب توبہ کیجئے بھلا وہ سیلاب رکنے والا تھا...... بہرحال میں اس قدر دل شکستہ ہوا کہ امرتسر میں چٹپٹے کی دوکان کر لی ...... اس میں شبہ نہیں کہ مرچوں کی تیزی کی وجہ سے دوکان چل نکلی۔ مگر بھلا ان چھوٹے چھوٹے کاموں میں میری طبیعت کہاں لگتی ہے۔ کئی بار دل چاہا کہ دوکان وغیرہ لٹا کر سنیاس لے لوں۔ مگر پھر خیال آیا کہ مرچیں آہستہ آہستہ اپنا کام کر رہی ہیں۔ جلدبازی اچھی نہیں...... جی ہاں آپ حضرات نے مجھے جلدباز مشہور کر رکھا ہے ...... کیا مثل کہتے ہیں آپ لوگ؟...... جی...... "جلد کام شیطان کا دیر کام رحمان کا" مانتے ہیں آپ کہ نہیں کہ میں جلدباز نہیں ہوں...... کتنے عرصہ کے بعد یہاں کے لوگوں کو راہ راست پر لایا ہوں...... سچ پوچھئے تو اس کام میں دیر لگنے کی ایک وجہ اور بھی ہوئی۔ ایک لنگوٹی باز بوڑھا بری طرح میرے کاموں میں ٹانگ اڑا دیا کرتا تھا۔ ...... اچھا ہوا کہ میرے ایک شاگرد نے اس کا کام ہی تمام کر دیا۔ ورنہ معلوم نہیں ابھی اور

کتنے دن مجھے زچ کرتا...... بہرحال جب میں نے دیکھ لیا کہ پھوڑا پک کر تیار ہو گیا ہے تو میں نے نشتر اٹھایا یعنی دکان چھوڑ چھاڑ ۱۹۴۷ء میں ایک اخبار نکال دیا...... وہ وہ ایڈیٹوریل لکھے کہ بس مزہ ہی تو آ گیا...... صرف اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ کئی عدد نئی جماعتیں بھی قائم کر دیں۔ لیڈر بنانے کا ایک کارخانہ بھی کھولا...... خیر کہاں تک اپنے منہ میاں مٹھو بنوں۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ تو آپ جانتے ہی ہیں۔ ...... ہاں تو اس بکواس کا مطلب یہ ہے کہ میں بہت ہی عدیم الفرصت واقع ہوا ہوں۔ جب سے دنیا آباد ہوئی آج تک سیر سپاٹے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اس میں شبہ نہیں کہ گھومتا پھرتا رہتا ہوں۔ مگر جب تک یکسوئی دماغ نہ حاصل ہو تفریح تفریح نہیں کہلاتی ...... کیا سمجھے"؟

"اتنا سمجھ گیا ہوں کہ اب شاید ساری زندگی اور کچھ نہ سمجھ سکوں۔"

"بہت اچھے"۔ شیطان صاحب لہک کر بولے "واقعی آپ سمجھ دار معلوم ہوتے ہیں۔"

"پھر آپ شرمندہ کر رہے ہیں مجھے"۔ میں نے لجاتے ہوئے کہا۔

"پھر وہی حماقت"۔ شیطان صاحب گرجے۔ "جب کوئی آپ کی تعریف کرے خاکساری کے بجائے مونچھوں پر تاؤ دیا کیجئے۔" میرا ہاتھ بے اختیار مونچھوں کی طرف جا کر ناکام واپس آیا اور میں کچھ جھینپ سا گیا۔ شیطان صاحب مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے بولے "کوئی بات نہیں...... کوئی بات نہیں؛ مونچھوں پر تاؤ دینے سے میری مراد یہ ہے کہ جب کوئی آپ کی تعریف کرے تو فخر سے سینہ تان لیا کیجئے۔ تعریف کرنے والے کی طرف منہ سکوڑ کر اس انداز سے دیکھئے جیسے وہ چھوٹے منہ سے بڑی بات کہہ رہا ہو۔ کیا سمجھے؟"

میں صرف مسکرا دیا۔ اس پر شیطان صاحب نے مجھے اس انداز سے دیکھا جیسے

ابھی کچھ اور ٹھونک بجا کر پرکھنا باقی رہ گیا ہو۔

"ہاں یہ تو آپ نے بتایا ہی نہیں کہ آج کل آپ کا کیا مشغلہ ہے"؟ میں نے دیا سلائی سے دانت کھتیرتے ہوئے پوچھا۔

"فی الحال ایک عدد ادبی رسالہ نکال رہا ہوں...... غالباً ابھی تک آپ نے پرچہ نہیں دیکھا۔" شیطان صاحب نے اپنا چرمی بیگ ٹٹولتے ہوئے کہا "بھئی میں نے سوچا کہ روز کے دھندے تو ہوتے ہی رہیں گے۔ لگے ہاتھوں کچھ ادبی خدمات بھی سرانجام دے لوں...... دیکھئے یہ رہا ماہنامہ "ہڑبونگ"...... ٹائیٹل کتنا دیدہ زیب ہے ......اس گرانی کے زمانہ میں ایسا شاندار پرچہ شائد آپ کو کہیں نظر نہ آئے...... ہڑبونگ کا آئندہ شمارہ "چل پکار نمبر" ہو گا۔ کیا خیال ہے آپ کا...... ہے نا معیاری رسالہ؟"

"بہت اونچا"۔ میں نے ورق گردانی کرتے ہوئے کہا۔

"بات یہ ہے کہ میں کچھ زیادہ وقت نہ دے سکا ورنہ اور زیادہ شاندار ہوتا"۔ شیطان صاحب چرمی ہینڈ بیگ کے تسمے چڑھاتے ہوئے بولے۔

"ایک بات ذرا قابل اعتراض ہے" میں نے سر کھجاتے ہوئے کہا "اشتہارات ضرورت سے زیادہ نظر آ رہے ہیں۔"

"یہی تو خاص بات ہے"۔ شیطان صاحب چہکے۔ "غریبوں کے اشتہارات مفت چھاپے جاتے ہیں"۔

"صرف یہی نہیں...... ایک خامی اور بھی ہے"۔

"وہ کیا؟" شیطان صاحب چیں بہ چیں ہو کر بولے۔

"کوئی مشہور لکھنے والا نظر نہیں آتا۔"

"کون سے سرخاب کے پر لگے ہوتے ہیں۔ مشہور لکھنے والوں میں"۔

شیطان صاحب نے بیزاری سے کہا "میں تو گندگی میں لعل تلاش کیا کرتا ہوں۔ اگر میں نے نئے لکھنے والوں کو نہ ابھارا تو ممکن ہے میرا مشن ہی فیل ہو جائے۔ مجھے تو دراصل ان حضرات کو نیچا دکھانا ہے جو خود کو لیکاک، سوئیفٹ اور برنارڈشا کا ہم پایہ سمجھے بیٹھے ہیں ...... کیا سمجھے؟"

"بالکل ٹھیک میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں"۔

"پھر وہی لغویت ...... بھئی آخر کب تک احساس کمتری کا شکار رہیں گے آپ؟"

"اوہ پھر بھول گیا"۔ میں نے اکڑ کر کہا۔ "شیطان صاحب آپ جھک مارتے ہیں ...... میرے اعتراضات اپنی جگہ اٹل ہیں"۔

"ول ڈن ...... ول ڈن"۔ شیطان صاحب پرجوش انداز میں چیخے۔ "بہت اچھے ...... اب کبھی نہ بھولئے گا"۔

"شیطان صاحب"۔ میں نے شاگردانہ انداز میں کہا "اگر آپ کے پاس شہرت حاصل کرنے کا کوئی مجرب نسخہ ہو تو عنائت فرمائیے۔"

"ضرور ضرور"۔ شیطان صاحب خوش ہو کر بولے۔ "مجرب اور ساتھ ہی ساتھ سہل الاصول بھی ...... ہزاروں بار کا آزمایا ہوا سو فیصدی کامیاب نسخہ ...... سنئے ...... مشہور ہونا ہے تو شراب پی کر بھوک بھوک چلائیے، لڑکیوں کی عصمت خراب کر کے سماج کو گالیاں دیجئے، مزدوروں کی مزدوری ہضم کر کے سرمایہ داری کے خلاف علم بغاوت بلند کیجئے، فقیروں کو دھتکار کر سگریٹ کا پیکٹ خریدتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہئے "آہ غریب ہندوستان" ...... بیوی کی کھال کھینچ کر بھس بھر دیجئے اور بقیہ زندگی طوائفوں کے سیوک بن کر گزاریئے ...... کیا سمجھے ...... ؟

"مگر ...... مگر"

"میں سمجھ گیا" شیطان صاحب نے خیالات میں گم ہو کر سر ہلایا۔ "آپ یہی کہنا چاہتے ہیں تاکہ لوگ اعتراضات کی بھرمار کر دیں گے۔ ...... سنئے اس کا بھی جواب ہے ...... اگر کوئی کچھ اعتراض کرے تو فوراً اپنے چہرے پر زلزلے کے آثار پیدا کر کے کہہ دیجئے کہ تالیوں کا کیچڑ چاٹے بغیر ایک اچھا فنکار ہونا قطعی ناممکن ہے۔ ...... فنکار صرف وہی ہو سکتا ہے جس نے زندگی کے ہر پہلو کو قریب سے دیکھا ہو۔ اس وقت تک فنکار ہونا قطعی ناممکن ہے جب تک کم از کم ایک بار لفنگوں کے ہاتھوں تاجپوشی عمل میں نہ آجائے ...... کیا سمجھے؟"

"آج پہلی بار اچھی طرح سمجھ میں آیا ہے" میں نے کہا "مگر یہ تو فرمائیے کہ آپ کی تشریف آوری کا کیا مقصد ہے"۔

"ہڑبونگ کے چل پکار نمبر کے لئے افسانہ لینے آیا ہوں۔"

"درست" "مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی عرض کروں گا کہ میں بلامعاوضہ ایک سطر بھی نہیں لکھتا"۔

"معاوضہ!" شیطان صاحب اس طرح اچھلے گویا کرسی نے ڈنک مار دیا ہو۔

"ذرا جلدی سے لاحول پڑھیئے میں اب یہاں ایک سکنڈ بھی نہیں ٹھہر سکتا ...... آپ تو میرے بھی چچا نکلے"۔

یہ کہہ کر شیطان صاحب نے کھڑکی سے چھلانگ لگائی اور دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے بہت دور تک فضائے بسیط میں تیرتے چلے گئے۔

میری سوانح عمری

یقین کیجئے اب تک اسی امید پر جی رہا تھا کہ کسی رسالہ کا ایڈیٹر مجھ سے میری "سوانح عمری" ضرور طلب کرے گا اور آپ اسے پڑھ کر آٹھ اور آٹھ سولہ آنسو روئیں گے۔ مگر برا ہو معاصرانہ تعصب کا کہ کسی نے بھی مجھے "زحمت" دینے کی "سعادت" نہ حاصل کی۔ جس کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا۔ یعنی اردو ادب کا وجود خطرے میں پڑ گیا۔ اس خسارے کا ازالہ نہیں ہو سکتا۔ جس سے اردو ادب اس دوران میں دوچار ہو چکا ہے۔ بات کا بتنگڑ بنانے سے کیا فائدہ؟ مختصر یہ کہ ابھی تک کسی کی سمجھ میں نہ آسکا کہ سسک سسک کر دم توڑتی ہوئی اردو کو میری سوانح عمری کی ضرورت ہے۔ ایسی صورت میں میرا کیا فرض ہونا چاہئے؟ بھئی میں اردو کا دشمن تو ہوں نہیں کہ یہ سب دیکھتے ہوئے بھی ہاتھ پہ ہاتھ اور پیر پر غالباً پیر دھرے بیٹھا رہوں۔ میں اپنی سوانح عمری لکھ رہا ہوں۔ اگر کوئی نہ چھاپے گا تو خود ایک عدد رسالہ نکال دوں گا۔ بہرحال یہ اردو کی بقاء کا سوال ہے۔

میں اسی صدی کے کسی سنہ میں یکم اپریل کو ہنالولو اور ٹمبکٹو کے درمیان ہوائی جہاز پر پیدا ہوا۔ اس لئے ہوائی جہاز کی بہت عزت کرتا ہوں اور پٹرول کو آب حیات سے کم نہیں سمجھتا۔ سال میں ایک بار پٹرول سے غسل کرنا نجات کے لئے ضروری سمجھتا ہوں۔ حب الوطنی کا یہ عالم ہے کہ جہاں ہوائی جہاز کی آواز سنی کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر چارپائی کے نیچے دبک جاتا ہوں۔ ہوائی جہاز کی شان میں اب تک تین

ٹھمریاں اور پانچ دادرے لکھ چکا ہوں۔ اگر شادی نہ ہو گئی ہوتی تو ابھی اور لکھتا۔

تین سال کی عمر میں ایک مکتب میں بسم اللہ ہوئی اور نتیجہ کے طور پر ایک مولوی نما آدمی یا آدمی نما مولوی کے ہاتھوں کافی عرصے تک "بسم اللہ واللہ اکبر" ہونا پڑا۔ مولوی صاحب مرحوم بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ اکثر میری ذہانت سے خوش ہو کر فرمایا کرتے تھے۔ "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔" تم بڑے ہو کر یقیناً نام پیدا کرو گے۔ تمہارا بچپن فخر قوم، محسن الادب حضرت شیخ چلی رحمتہ اللہ علیہ کے روائتی بچپن سے بہت ملتا جلتا ہے۔

چار سال کی عمر میں ایک انگریز سارجنٹ میجر کی لڑکی پر باقاعدہ عاشق ہو کر شاعری کرنے لگا۔ ایک دن ایک مشاعرہ میں غزل پڑھ رہا تھا کہ ایک شعر پر ایک بزرگ کے منہ سے بے ساختہ نکلا "میاں جوان ہوتے نظر نہیں آتے" سنتے ہی تاؤ آگیا اسی دن سے شاعری واری چھوڑ چھاڑ جوان ہونے کی تدبیریں کرنے لگا۔ آپ جانئے لاگ بری چیز ہوتی ہے۔ ایک دن بیٹھا جوان ہونے کے امکانات پر غور کر رہا تھا کہ اچانک ذہن رسا دور کی کوڑی لایا___ جھٹ پردادا مرحوم کے کتب خانے سے مثنوی "زہر عشق" کا قلمی نسخہ نکالا اور اباں کر پی گیا___ کیا عرض کروں آپ سے کہ کیا حالت ہوئی۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ دوسرے ہی دن رسائل اور اخبارات میں اشتہار دینا پڑا "بہتوں کا بھلا اس کے پڑھنے سے ہوگا"___ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ذہنی اور جسمانی نشوونما کے ساتھ ساتھ رجحانات میں بھی تبدیلی ہوتی جاتی ہے۔ لہٰذا خاکسار کا دل "خالق باری" سے قطعی اچاٹ ہو گیا اور کویراج ہرنام داس کے "ہدایت نامہ خاوند" میں کافی مزہ ملنے لگا..... اس قسم کی سینکڑوں کتابیں پڑھ ڈالیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں افسانہ نگار ہو گیا۔ شروع شروع میں ایک عدد قلمی نام اختیار کر کے لکھتا رہا۔ آپ نے چ، غ، د، مظفرپوری کے افسانے ضرور پڑھے ہوں گے۔ وہ یہی خاکسار

ہیچ مقدار ہے۔ میرے ادبی دنیا میں قدم رکھتے ہی بھونچال سا آگیا۔ "ترقی پسندوں" نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا اور رجعت پسندوں نے فحش نگاری کا مرتکب قرار دے کر گالیاں دینی شروع کر دیں۔ میں نے ان کی بکواس کی قطعی پرواہ نہ کی۔ کیونکہ ترقی پسند جماعت میری پشت پناہ تھی ـــــ مگر کچھ دنوں کے بعد اچانک ایسا انقلاب رونما ہوا کہ ہاتھوں کے طوطے پھر سے اڑ گئے ـــــ رجعت پسند تو خیر دشمن تھے ہی ترقی پسندوں نے بھی آنکھیں پھیر لیں۔ انہوں نے "وقتی تقاضوں" کی ہانک لگائی اور جنس کی اولیت کے سرے ہی سے منکر ہو گئے۔ اب ان حضرات نے لاشعور سلمہ اللہ تعالٰی کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ تحلیل نفسی کو ادب سے خارج کر کے ہسٹیریا کے مریضوں کی میراث قرار دے دی۔ کہاں تک ان کے مظالم کا تذکرہ کروں۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں کلیجہ منہ کو نہ آجائے اور دماغ معدے میں نہ چلا جائے۔ بہرحال اب ترقی پسند گروہ مجھے صرف جدت پسند کے نام سے یاد کرتا ہے۔ ترقی پسند کہنے کے لئے تیار نہیں۔ خیر مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ میں بہت اونچا لکھنے والا ہوں۔ اپنی راہ آپ متعین کرنے والا ـــــ میں حقیقی معنوں میں فنکار ہوں اس لئے کسی سے متاثر یا مرعوب نہیں ہو سکتا۔ میں وہی لکھوں گا جو میرا دل چاہے گا۔

میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں کہ میں اردو کا سچا خادم ہوں۔ مجھے شہرت کی قطعی پرواہ نہیں۔ اس لئے ہر سڑے بسے رسالے کا مدیر بلامعاوضہ میرے مضامین چھاپنے پر تیار نہیں ہوتا تو میں انتقاماً اس کے رسالے کا خریدار بن جاتا ہوں اگر اس پر بھی دل نہیں مانتا تو دو چار خریدار بنوا دیتا ہوں۔ بہرحال شکست اسی کی ہوتی ہے۔

مجھے ہر پرانی چیز سے نفرت ہے۔ اس خیال کے ماتحت کبھی کبھی نئی چیزوں سے بھی متنفر ہو جانے کو دل چاہنے لگتا ہے کہ کچھ دن بعد یہ بھی پرانی ہو جائیں گی۔ چونکہ ادب کو زندگی کا آئینہ دار سمجھتا ہوں۔ اس لئے ادب میں تو پرانی چیزوں کا سرے ہی

سے قائل نہیں۔ آج کے ادب میں "تیر نظر" اور "مژگاں کے خنجر" کا تذکرہ مجھے انتہائی درجہ لچر معلوم ہوتا ہے۔ یہ سائنسی اور مشینی دور ہے۔ ہمارے ادب کو صحیح معنوں میں اس دور کا عکاس ہونا چاہئے۔ لہٰذا اب تیر، خنجر کٹار، شمشیر کی جگہ رائفل، پستول، برن گن، توپ اور ایٹم بم کو کھپانے کی ضرورت ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت قلق ہوتا ہے کہ ہمارے ادیب ان چیزوں کی طرف سے بہت زیادہ عدم توجہی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ اسے میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس سلسلہ میں بہتری مشکلات ہماری راہ میں حائل ہو جاتی ہیں۔ لیکن ہمیں ان پر قابو حاصل کرنا چاہئے۔ آخر ہم کب تک دوسروں کے اشاروں پر ناچتے رہیں گے۔ ہمیں چاہئے کہ ہم ان رکاوٹوں کا سدباب کریں۔ اس سلسلے میں جو سب سے بڑی دشواری پیش آتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر ہم ان آتش گیر اسلحہ جات کو محبوب سے منسوب کریں تو حکومت اس غریب کی نگرانی شروع کر دے گی اور کچھ تعجب نہیں کہ ضمانت طلب کر لی جائے۔ لہٰذا اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم حکومت کے سامنے محبوب کا صحیح جغرافیہ پیش کر دیں اور اسے سمجھائیں "اماں ہم سچ مچ تھوڑا ہی کہتے ہیں یہ تو شاعری ہے شاعری" ـــــ اس طرح جیل جانے سے بھی بچ جائیں گے اور مقصد بھی حل ہو جائے گا۔

آج کے ادیب کی دوسری چیز جو مجھے بہت زیادہ کھلتی ہے یہ ہے کہ وہ نئی تحقیقات سے قطعی بے بہرہ ہے۔ جب وہ یہ کہتا ہے "دل آگیا تم پر دل ہی تو ہے" تو مجھے غصہ آجاتا ہے جہالت کی حد ہو گئی۔ ارے بابا دل کے متعلق یہ بہت پرانا نظریہ ہے۔ اب یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ دل سوائے دوران خون کے اور کسی چیز کا ذمہ دار نہیں۔ عاشق ہو جانے کا تعلق صرف دماغ سے ہے۔ لہٰذا اب "دل آجانا" کی بجائے "دماغ آجانا" بولنا اور لکھنا چاہئے۔ آج کل "دل ٹوٹنا" کے بجائے "سر پھوٹنا" زیادہ موزوں اور اچھا معلوم ہوتا ہے۔

آج کے ادب میں پرانے محاورات کا استعمال بھی میرے لئے کم اذیت ناک نہیں ـــــ بھلا بتایئے تو کیا تک ہے "نہ نو من تیل ہو گا نہ رادھا ناچیں گی" ـــــ آج کی رادھا اور نو من تیل! ـــــ لاحول ولا قوۃ ـــــ رادھا کو کیا پڑی ہے کہ خواہ مخواہ تیل کا مطالبہ کرے۔ ایسی صورت میں جب کہ چراغاں کے لئے پاور ہاؤس کی خدمات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ لہٰذا اب اس محاورے کو یوں ہونا چاہئے "نہ اسٹیج ہو گا اور نہ رادھا ناچیں گی" اسی طرح اور بہتیرے محاورے سرے سے ترک ہی کر دیئے جائیں یا پھر وقتی ضروریات کے لحاظ سے ان میں مناسب ردو بدل کیا جائے۔

لیجئے میں اپنی سوانح عمری اور عادات و خصائل بیان کرتے کرتے ادبی بحثوں میں پڑ گیا۔ ہاں عرض کرنے کا مطلب یہ کہ میں جینئس ہوں۔ ایسے لوگ ہمیشہ تین چار صدی کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ یہ تو اتفاق وقت ہے کہ میں برنارڈ شا کے زمانے میں پیدا ہو گیا۔ ورنہ قاعدے کی رو سے مجھے اب سے تین سو برس بعد پیدا ہونا چاہئے تھا۔

میں سگریٹ بکثرت کھاتا ہوں اور دنیا کا کوئی ایسا نشہ نہیں جو مجھ سے بچا ہو۔ اکثر سر میں برانڈی کی مالش کراتا ہوں۔ افسانہ لکھنے سے پہلے شراب میں افیون، چرس، گانجہ، بھنگ، چانڈو، مدک اور کوکین وغیرہ ملا کر پیتا ہوں تاکہ انداز تحریر میں بکثرت انفرادیت پیدا ہو سکے۔ آپ نے میری نظم "کیلا خاں" ضرور پڑھی ہو گی۔ وہ نظم نامکمل ہے لیکن پھر بھی دنیا کی سب سے زیادہ مکمل نظم خیال کی جاتی ہے۔ میں وہ نظم کہہ ہی رہا تھا کہ نشہ اکھڑ گیا اور نظم ادھوری رہ گئی۔

عورتوں سے نفرت کرتا ہوں۔ عورتوں کو دیکھ کر مجھ پر ایک قسم کی جمہوری کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور بے اختیار نعرے لگانے اور جیل جانے کو دل چاہنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادبی فیشن کے مطابق انجکشنوں کے سہارے زندگی بسر کر رہا

ہوں۔

یوں تو مجھے اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ بے حد پسند ہے لیکن کچھ اور چیزیں بھی ہیں۔ جنہیں میں پسند کرتا ہوں۔ مثلاً بیماریوں میں مجھے تپ دق اور ترکاریوں میں کریلا بے حد مرغوب ہے۔ مٹھائیوں میں وہ پسند ہے جو مفت مل جائے۔ فاؤنٹین پن اسی وقت پسند آتا ہے جب چرانے میں کامیاب ہو جاؤں۔ پڑوسیوں میں وہ حضرات پسند ہیں جن کے یہاں مرغیاں پلی ہوئی ہیں۔ احباب میں وہ پسند ہیں جو قرض دے کر بھول جاتے ہیں اور بتاؤں ـــــ خیر چھوڑیئے شرم آ رہی ہے۔

ایک دن میرا انتقال پر ملال عمل میں آیا جس میں جملہ اعزا کے علاوہ بعض بے حیا احباب نے بھی شرکت کی تھی۔ ویسے اپنا انتقال تو روز ہی ہوتا رہتا ہے۔ بس گھر سے باہر نکلنے کی دیر ہوتی ہے۔ قدم قدم پر انتقال۔ مگر کسی گدھے نے آج تک ایک بھی قطعہ تاریخ وفات نہ کہا ـــــ خیر ـــــ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

شاعر کو جواب

محترم شاعر! اکثر اخبارات کے ذریعہ آپ کی بعض دشواریوں سے آگاہ ہوتا رہتا ہوں۔ کبھی کبھی آپ ایسے سوالات کرتے ہیں جن سے مترشح ہوتا ہے کہ خود آپ کے پاس بھی ان کا کوئی جواب نہیں ہے۔ اکثر آپ کی "التجائیں" بھی نظر سے گزری ہیں۔ مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ کوشش کر رہا ہوں کہ آپ کی دشواریوں کا حل تلاش کر سکوں۔ ملاحظہ فرمایئے ایک بار آپ نے اپنی حالت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

میری آنکھوں سے آنسو رواں ہیں
میرے بچپن کے ساتھی کہاں ہیں

حضور! جو ساتھی جیل میں نہ ہوں گے وہ یقینی طور پر آپ کے گاؤں میں موجود
ہوں گے۔ ان سے مل بیٹھنے کا طریقہ یہ ہے کہ ایک پوسٹ کارڈ لکھ کر لیٹر بکس میں
ڈال دیجئے۔ ان کا اور اپنا پتہ لکھنا نہ بھولئے گا۔ پوسٹ کارڈ کا نام یاد رہے گا نا آپ
کو۔۔۔ ہاں اچھی طرح یاد رکھئے گا۔ ورنہ خطرہ ہے کہ آپ پوسٹ آفس سے راشن کارڈ
طلب کر بیٹھیں۔ بے خبر ہی ٹھہرے دنیا و مافیہا سے۔۔۔ لے بس اب رونا دھونا
چھوڑیئے۔۔۔ ورنہ۔

اگر یونہی اے میر روتا رہے گا
تو کاہے کو ہمسایہ سوتا رہے گا

پھر آپ فرماتے ہیں۔

نے جواہر نہ کمخواب و اطلس
کچھ نہیں چاہئے مجھ کو اے دل

بھائی صاحب: یہ آپ کیا فرمارہے ہیں۔ ارے کل ہی تو یہ ساری چیزیں میں
نے آپ کے لئے خریدی تھیں۔ آپ نے گویا میرا دل ہی توڑ دیا۔ اچھی بات ہے اب
میں آپ کی خدمت میں کنکر پتھر اور کپاس کے چند گٹھڑ پیش کروں گا۔ بس آپ خوش
رہیں کسی طرح۔ کیونکہ آپ کو بسورتے دیکھ کر میرا کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔ انہی
دشواریوں کے سلسلے میں آپ پھر ایک سوال کر بیٹھے ہیں۔

اور وہ گل رخ نہ جانے کہاں ہو
کیا پتہ یاد کرتی ہو مجھ کو

اف فوہ! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے اس طرح
انجان بن رہے ہیں۔ ارے بھیا! کل ہی تو ان سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ وہ آج کل
سول ہسپتال میں مڈوائف ہیں۔ آپ کا تذکرہ آیا تو ناک بھوں چڑھا کر ذہن پر زور

دینے لگیں۔ پھر بولیں۔ اگر کبھی انہوں نے مجھے کوئی کیس دلوایا ہو گا تو پھر شناسائی
سمجھئے۔ ویسے یاد نہیں پڑتا کہ میں انہیں جانتی ہوں۔ اب آپ کی ایک التجا بھی یاد آرہی
ہے۔

اے ہواؤ ادھر سے گزرنا
تو یہ پیغام میرا بھی کہنا!

مجھے یقین ہے ہواؤں نے آپ کا کوئی پیغام ان تک نہ پہنچایا ہو گا۔ کیونکہ
پروسیجر ہی غلط تھا۔ بھائی:۔ یہ بیسویں صدی ہے۔ تھوڑی سوجھ بوجھ سے کام لینا
چاہئے۔ ہو سکتا ہے کہ اب سے دو سو سال پہلے کی ہوائیں از راہ سعادت مندی صرف
معمولی سی استدعا پر ہی پیغام رسانی کے فرائض انجام دے ڈالتی ہوں۔ آج کل کی
ہوائیں تو سب سے پہلے یہ پوچھتی ہیں۔

"کن ہواؤں میں رہتے ہو پیارے

مطلب یہ کہ آئندہ اگر ہواؤں نے ذریعہ پیغام بھجوانا ہو تو سیدھے ریڈیو
اسٹیشن چلے جایئے گا۔ لیکن بچوں کا پروگرام صرف سنڈے کے سنڈے ہوتا ہے۔ خیر
سنڈے کا ہوش تو رہتا ہی ہو گا آپ کو۔ کیونکہ شاعری کے ساتھ ساتھ کلرکی سے بھی
شغل فرماتے ہوں گے۔ مجھے یقین ہے۔
ارے:۔ لیجئے وہ پیغام بھی یاد آگیا جو آپ نے ہواؤں کے سپرد کیا تھا۔

ان سے کہنا وہ راتیں کہاں ہیں
جب تمنا حسین تھی جواں تھی!

بھئی یہ تو خود میں نے ہی ان سے پوچھ لیا تھا۔ کہنے لگیں۔ اپن کو تو بس وہ رات
بڑی پیاری لگتی ہے جب کوئی تگڑا سا کیس مل جائے۔ اس وقت تمنا بھی حسین اور
جوان نظر آتی ہے۔ مڈوائف بننے سے پہلے کا ہوش نہیں کہ کس وقت تمنائیں حسین

اور جوان معلوم ہوا کرتی تھیں۔

اب آپ کا آخری سوال پیش نظر ہے۔

جنم ہی کیوں لیا تھا بتاؤ!!
سانس کیوں لے رہا ہوں اب تک

واقعی یہ بڑی واہیات بات ہے کہ آپ ابھی تک سانس لے رہے ہیں۔ بتایئے میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں۔ جنم لے کر بھی آپ نے سخت غلطی کی تھی۔ اسے انکار کر دیا ہوتا پیدا ہونے سے۔ کوئی کیا بگاڑ لیتا۔

خیر اب اگر آپ سانس نہیں لینا چاہتے تو ریڈیو والوں سے رجوع کیجئے ان کے یہاں اکثر ایک ریکارڈ سنایا جاتا ہے۔ جس کی سچویشن یہ ہے کہ محترمہ ہیر اپنے رانجھا کے لئے دودھ کا گلاس لے کر جاتی ہے اور گانا شروع کر دیتی ہے۔

دودھ پی لے ظالما
او میں کدوں دی کھڑی
دودھ پی لے بالما

اس ریکارڈ کی فرمائش کیجئے ریڈیو والوں سے۔ اگر سنتے ہی دم نہ نکل جائے تو میرا ذمہ ـــــ دیگر احوال یہ ہے کہ باقی سب خیریت ہے۔ کبھی کبھی آپ اپنی خیریت کا خط لکھتے رہا کریں۔

تجسّس کی ناک

پرانے برگد کی جٹائیں تھام کر جھولا جھولتے ہوئے ہم سب تالاب میں کود پڑے اور کنارے بیٹھے ہوئے بہت سے مینڈک فراٹے بھرتے ہوئے پانی میں غائب ہو گئے۔ پانی میں آدھی ڈوبی ہوئی بھینسوں کو دیکھ کر مجھے بابا فضلو یاد آ جاتے ہیں۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر یہ بھینسیں حقہ پی کر کھانسنے لگیں اور بابا فضلو کے سر پر سینگ نکل آئیں تو کیسی رہے۔ پر میں نے یہ کسی سے کہا نہیں اور کہہ بھی کیسے سکتا ہوں، بچہ جو ٹھہرا، پٹ نہ جاؤں گا، ابھی کل ہی چچا جان نے دادا جان کو ڈانٹ دیا تھا۔ سن کر چپ ہو رہے کچھ نہیں بولے۔ ابھی میں ذرا سا ڈانٹ دوں تو ابا میاں مجھے اٹھا کر پٹخ دیں...... بچہ جو ٹھہرا......

آج ہم سب نے طے کیا تھا کہ تالاب پار کریں گے اور واپسی پر پانی میں کھلے ہوئے کمری کے پھولوں کے تلے کو کابیلی تلاش کریں گے۔ ابا کہتے ہیں کہ کمری کے پھولوں تلے پانی میں ایک بہت ہی خطرناک گھاس ہوتی ہے، جس میں بچے پھنس کر مر جاتے ہیں۔ مگر وحید کہتا ہے کہ وہ کئی کئی بار کو کابیلیاں توڑ کر کھا چکا ہے۔ وہ بھی تو میری طرح بچہ ہے وہ کیوں نہیں گھاس میں پھنس کر مر گیا؟ میں ابا سے پوچھوں گا، مگر پوچھنے سے کیا فائدہ، چونکہ میں بچہ ہوں، اس لئے اسے سمجھ نہ سکوں گا، سب یہی کہہ کر ٹال دیتے ہیں، کوئی میری باتوں کا جواب ہی نہیں دیتا۔

جب ہم تالاب سے نکلے تو ہم سبھوں کے پاس کوکابیلیاں تھیں اور ہم میں

سے کوئی بھی خطرناک گھاس میں پھنس کر مرا نہیں تھا، ہم سب برگد کی پھیلی ہوئی چکنی جڑوں پر بیٹھ کر کوکا بیلی کے لیس دار دانے چبانے لگے، میں نے سوچا کہ ایک کوکا بیلی شمی کے لئے بھی لیتا چلوں مگر پھر خیال آیا کہ ابا میاں مجھے زندہ دیکھ کر چانٹے رسید کرنے لگیں گے، ہم سب ننگے تھے میں نے سوچا کہ کہیں چچا جان مچھلی کا شکار کھیلنے نہ آرہے ہوں۔

میں نے جلدی سے کپڑے پہن لئے، وہ کہتے ہیں کہ ننگے ہو کر نہ نہایا کرو میں کہتا ہوں کہ وحید، کلو، موہن اور چھنکو سبھی تو ننگے ہو کر نہاتے ہیں۔ وہ چیخ کر کہتے ہیں کہ وہ سب کمینے ہیں تم شریف آدمی کے لڑکے ہو، میں اکثر سوچنے لگتا ہوں کہ میں شریف آدمی کا لڑکا کیوں ہوں اور سب کمینے کیوں ہیں؟ مگر میں کسی سے پوچھتا نہیں، پوچھوں تو چانٹے کھاؤں، نہ جانے کیوں یہ لوگ میری باتوں کا جواب نہیں دیتے۔

موہن نے بتایا کہ اس کی بکری نے ننھا سا بچہ جنا ہے، ہم سب بکری کا بچہ دیکھنے کے لئے بےقرار ہو گئے اور کپڑے پہن کر موہن کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ ننھا سا بچہ دھوپ میں کھڑا کانپ رہا تھا اور بکری اسے چاٹ رہی تھی ہم لوگوں نے موہن کے کاکا سے کہا کہ ہم لوگ اپنے گھروں سے بکری کے بچے کے لئے مٹھائی لائیں گے، موہن کے کاکا نے کہا "بکری کا بچہ مٹھائی نہیں کھاتا" مٹھائی پر مجھے ایک بات یاد آگئی۔

میں نے موہن کے کاکا سے پوچھا "موہن کا ختنہ کب کراؤ گے؟" موہن کے کاکا نے ہنس کر کہا جب تم جنیو پہنو گے۔ میں نے کہا کہ ہمارے یہاں کوئی بھی جنیو نہیں پہنتا، وہ بولے ہمارے یہاں ختنہ نہیں ہوتا، میں نے کہا کیوں نہیں ہوتا، کہنے لگے تم ابھی بچے ہو، یہ باتیں نہیں سمجھ سکتے، اس کے بعد ہم سب اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے۔

مجھے کہانیاں بہت اچھی لگتی ہیں۔ بہت رات کہانیوں کے شوق میں جاگتا رہتا ہوں۔ کل رات چچا جان نے ایک بہت اچھی کہانی سنائی ایک سوداگر تھا جس کا لڑکا

جھوٹ بہت بولتا تھا، سوداگر نے اس کو بہت سمجھایا کہ جھوٹ مت بولا کر، پر وہ نہ مانا ہمیشہ جھوٹ بولتا رہتا تھا۔ ایک دن ایک فقیر آیا سوداگر نے اس سے اپنے لڑکے کے بارے میں بات چیت کی فقیر نے کہا کہ وہ بہت جلد جھوٹ بولنا چھوڑ دے گا۔ تم یہ ہار لو اور اس کے گلے میں ڈال دو جب وہ جھوٹ بولنے لگا کرے گا تو یہ ہار خود بخود بڑھ جایا کرے گا اور تم سمجھ لیا کرو گے کہ وہ اس وقت جھوٹ بول رہا ہے، لڑکے کو ہار کی خاصیت معلوم ہو گئی اور وہ جھوٹ بولنے سے ڈرنے لگا۔

مجھے یہ کہانی بہت پسند آئی، میں سوچتا ہوں کہ وہ فقیر مجھے مل جائے تو بڑا مزا آئے، میں اس سے بہت سارے ہار مانگ لوں، ایک تو چچا جان ہی کی گردن میں ڈال دوں، چچا جان دن بھر تاش کھیلتے رہتے ہیں۔ مگر جب دادا جان پوچھتے ہیں کہ کیا کر رہے تھے تو کہتے ہیں کہ آسامیوں سے روپیہ وصول کرنے گیا تھا۔ اگر چچا جان کے گلے میں بھی وہی فقیر والا ہار ہو تو کیسی رہے۔ دادا جان کو چاہئے کہ اس فقیر کو ضرور تلاش کریں۔

آج باجی زرینہ نے ایک بڑی اچھی کہانی سنانے کا وعدہ کیا ہے۔ باجی زرینہ کا گھر ہمارے گھر کے پاس ہی ہے، مجھے باجی زرینہ بہت اچھی لگتی ہیں وہ مجھے بہت پیار کرتی ہیں، مجھے پریوں کی کہانیاں سنایا کرتی ہیں، میں نے آج تک کوئی پری نہیں دیکھی۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر مجھے کوئی پری، پرستان اٹھا لے جائے تو کتنا اچھا ہو، میں وہاں خوب جلیبیاں کھاؤں، خوب گھوموں پھروں اور اماں جو مجھے بہت پیار کرتی ہیں، خوب روئیں اور میں پھر بھی گھر واپس نہ آؤں۔ وہیں پریوں کے لڑکوں کے ساتھ مزے سے گلی ڈنڈا کھیلوں، پتنگ اڑاؤں، پر میں باجی زرینہ سے ملنے ضرور آیا کروں گا، وہ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں مجھے بہت پیار کرتی ہیں۔ مگر جب وہ اپنی ناک کی ننھی سی کیل اتار ڈالتی ہیں تو بہت پھیکی پھیکی لگنے لگتی ہیں۔ میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ وہ اپنی ناک کی کیل نہ اتارا کریں، نہیں تو میں انہیں پیار نہ کروں گا۔

کل مجھے ان پر بہت غصہ آیا تھا۔ مگر میں نے ان سے کچھ کہا نہیں کیونکہ وہ

مجھے پیار کرتی ہیں۔ کل میں نے ان سے پوچھا کہ پریاں کیسی ہوتی ہیں، انہوں نے کہا بہت خوب صورت۔ میں نے کہا تم سے بھی زیادہ؟ انہوں نے ہنس کر میرے گال میں بڑے زور سے چٹکی کاٹ لی اور میں تلملا گیا۔ مگر وہ مجھے پیار بھی تو کرتی ہیں۔ میں اکثر ان کے بازوؤں میں دانت کاٹ لیتا ہوں مگر زور سے نہیں، نجانے کیوں میرا دل چاہتا ہے کہ ان کے بازو کا گوشت اپنے دانتوں میں دبائے رکھوں۔ اگر ان کے گوشت میں جلیبیوں والا شیرہ بھرا ہوتا تو کتنا مزا آتا۔

باجی زرینہ بہت شرمیلی ہیں مگر ایک دن میں نے دہلیز میں دیکھا تھا وہ اختر چچا سے پنجہ لڑا رہی تھیں مجھے دیکھ کر شرما گئیں۔ اختر چچا نے مجھے گود میں اٹھا لیا اور کہنے لگے کسی سے کہنا نہیں، مجھے جلیبیاں بہت اچھی لگتی ہیں، میں نے کہا میں کسی سے نہ کہوں گا۔

اختر چچا میرے چچا کے دوست ہیں۔ اس لئے میں انہیں اختر چچا کہتا ہوں۔
باجی زرینہ کے نہ جانے کون لگتے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا تھا کہ تم ہمارے چچا جان سے پنجہ کیوں نہیں لڑاتیں کہنے لگیں "وہ بہت خراب آدمی ہیں"
"واہ - وہ تو شریف آدمی ہیں۔ کبھی ننگے ہو کر نہیں نہاتے"۔ میں نے کہا تو وہ پھر شرما گئیں۔ "پنجہ لڑانے کا حال کسی سے نہ کہنا"۔ میں نے کہا "نہ کہوں گا مگر تم اختر چچا سے نہ بولا کرو۔ وہ مجھے اچھے نہیں لگتے۔ انہیں دیکھ کر مجھے بہت غصہ آتا ہے۔ میں ابا میاں سے کہوں گا کہ وہ اختر چچا کو بندوق سے مار دیں۔"
وہ کچھ سوچنے لگیں اور پھر آہستہ سے لمبی سانس لے کر بولیں "ان سے کہہ دیا تو مجھے بھی بندوق سے مار دیں گے" میں نے گھبرا کر کہا "واہ تمہیں کیوں؟" وہ آہستہ سے بولیں۔ "یونہی ..... تم نہیں سمجھتے" اور پھر وہ اداس ہو گئیں، نہ جانے کیوں۔
باجی زرینہ نے مجھے بتایا ہے کہ پریاں جنگلوں میں سیر کرنے آتی ہیں، میں انہیں ضرور تلاش کروں گا۔ میں ان سے کہوں گا کہ مجھے بھی پرستان لے چلو۔ وحید اور موہن کہتے ہیں کہ وہ بھی پرستان چلیں گے مگر میں پھنگو کو نہ لے جاؤں گا۔

گالیاں بکتا ہے۔ ہمیں اپنے دم کٹے کتے سے کٹانے کو کہتا ہے کہ کسی دن تم لوگوں پر کتا چھوڑ دوں گا اور وہ تم لوگوں کو چیر پھاڑ کر کھا جائے گا۔ پرستان سے لوٹ کر ہم لوگ جادو کے ڈنڈے سے اسے کتا بنا دیں گے، پھر اس کا باپ ہماری خوشامد کرے گا، کہے گا کہ میرے پھنگو کو پھر آدمی بنا دو مگر اسے آدمی نہ بنائیں گے۔
میں، وحید اور موہن نے جنگل میں گھس گھس کر دیکھا مگر ہمیں کہیں بھی پریاں نہ دکھائی دیں۔ ہم نے بہت سی جھڑبیریاں توڑیں اور کھا کھا کر گٹھلیاں ایک دوسرے پر پھینکنے لگے۔ جھیو ل کی جھاڑیوں میں سرسراہٹ ہوئی اور ہم سب چونک پڑے۔ ایک بڑا سا مور اپنی لمبی سی دم لہراتا ہوا اڑا جا رہا تھا۔ ہم سب ہنسنے لگے۔
موہن نے کہا "کہیں یہی پری نہ ہو"۔ وحید بولا "ہاں، ہاں پریاں ہر طرح کی شکل بنا سکتی ہیں"۔ پھر ہم مور کے پیچھے دوڑنے لگے۔ وہ پھر اڑا اور دور کے ٹیلے پر جا بیٹھا۔ ہم سب دوڑتے رہے حتیٰ کہ وہ جھبول کی گھنی جھاڑیوں میں کھو گیا ہم تینوں تھک گئے تھے۔ ٹیلے کے نیچے تالاب کے کنارے بیٹھ گئے ــــــ اور کنکریاں پانی میں پھینکتے رہے۔

اچانک موہن بولا "وہ کیا؟"۔ ہم چونک پڑے۔ موہن نے اشارہ کیا۔
پانی میں جہاں پر بہت سے بگلے بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمیں بہت سے پکے پکے شہتوت نظر آئے "شہتوت" میں نے کہا اور ہم سب اٹھ کر ادھر چلے گئے۔ بگلے اڑ کر دوسرے کنارے پر جا بیٹھے۔ موہن نے کہا۔ "شہتوت کا درخت ہوتا ہے۔ میں نے بلرام نگر میں اپنے نانا کے باغ میں دیکھا تھا۔ مگر یہ بھی شہتوت ہی جان پڑتے ہیں" وحید نے کہا۔ "میں نے شہتوت کا پیڑ کبھی نہیں دیکھا مگر بازار میں شہتوت کہاں سے آتے ہیں"۔

میں نے لپک کر ایک شہتوت توڑا اور منہ میں رکھ لیا۔ چباتے ہی اوبکائی آئی اور کچلا ہوا شہتوت منہ سے نکل پڑا۔ افوہ کتنا کڑوا تھا۔ وحید نے پوچھا "کیا ہوا؟" میں نے منہ بناتے ہوئے کہ "بہت کڑوا ہے" موہن نے گھبرا کر کہا۔ "تو پھر یہ

ضرور جادو کے شہتوت ہیں۔ وہ پری کوئی جادوگرنی تھی۔ یہی تو میں کہہ رہا تھا کہ شہتوت کا تو پیڑ ہوتا ہے۔ " ہم سب ڈر کر بھاگے۔

میرے منہ کی کڑواہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ تھوکتے تھوکتے حلق خشک ہو گیا تھا۔ وحید نے بتایا کہ اس کی ماں کہتی تھیں کہ زہر کڑوا ہوتا ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میری جان نکل رہی ہو۔ کہیں میں نے زہر تو نہیں کھا لیا تھا۔ میرے منہ کی کڑواہٹ اور بڑھ گئی۔

گھر آکر میں چپ چاپ لیٹ گیا۔ میں نے کسی سے بتایا نہیں کہ میں تھوڑی دیر میں مر جاؤں گا۔ میں نے زہر کھا لیا ہے۔ شام تک موت کا انتظار کرتا رہا مگر میں مرا نہیں۔ وہ ضرور جادو کے شہتوت تھے۔ اب میں پریوں کو کبھی نہ ڈھونڈوں گا مگر جادو کا ڈنڈا مل جاتا تو اچھا تھا۔ میں اختر چچا کو بلی کا بچہ بنا دیتا اور باجی زرینہ کو لے کر پرستان چلا جاتا۔

آج کل باجی زرینہ نہ جانے کیوں روتی رہتی ہیں۔ اب وہ مجھے پیار بھی تو نہیں کرتیں۔ ان کا پیٹ نہ جانے کیوں پھول رہا ہے۔ اختر چچا میرے چچا جان سے نہ جانے کیا باتیں کیا کرتے ہیں۔ بہت آہستہ آہستہ جنہیں میں سن نہیں پاتا۔

کل میں نے باجی زرینہ سے پوچھا کہ تمہاری توند کیوں نکل رہی ہے۔ ان کی اماں چیخ کر بولیں۔ "لے حرامزادی، کلموہی۔ سن لے چھوٹے چھوٹے بچے بھی تیری ہنسی اڑانے لگے۔" اور وہ یہ کہہ کر سر پیٹ پیٹ کر رونے لگیں۔ باجی زرینہ بھی منہ چھپا کر سسکیاں لینے لگیں اور میں ڈر کر بھاگ آیا۔

مجھے بڑا اچنبھا ہوا۔ میں باجی زرینہ کی ہنسی کب اڑا رہا تھا۔ ان کی اماں بڑی خراب ہیں۔ میں اب ان سے کبھی نہ بولوں گا۔ مگر باجی زرینہ کی توند کیوں نکل آئی ہے۔ وہ کچھ ایسی موٹی بھی تو نہیں ہیں۔ ہمارے گھر میں دن بھر باجی زرینہ کی برائی ہوتی رہتی ہے۔ خالہ جان کہہ رہی تھیں کہ زرینہ نے گاؤں بھر کی ناک کٹوا دی۔

میں سوچنے لگا کہ شاید باجی زرینہ کو جادو کا ڈنڈا مل گیا ہے جبھی تو انہوں نے

اتنی آسانی سے گاؤں والوں کی ناکیں کاٹ لیں۔ مجھے جو بھی ملتا میں اس کی ناک بڑے غور سے دیکھتا اور خالہ جان کے جھوٹ پر ہنستا۔ مگر پھر سوچتا کہ کسی کی ناک ٹٹول کر دیکھوں مگر موقع نہیں ملتا۔

آج چچا جان سو رہے تھے۔ میں قریب بیٹھا اپنا آموختہ یاد کر رہا تھا۔ یکایک جی میں آئی کہ چچا جان کی ناک ٹٹول کر دیکھوں میں نے ایسا ہی کیا۔ ملائم سی ناک تھی، بالکل ویسی ہی سب کی ہوتی ہے۔ چچا جان جاگ پڑے اور چیخ کر بولے۔ "یہ کیا کر رہا ہے۔" میں گھبرا گیا۔ میں نے کہا "ناک" انہوں نے میرے کان اینٹھ دیئے۔

میں رو رو کر کہنے لگا۔ خالہ جان ہی تو کہہ رہی تھیں کہ زرینہ نے گاؤں بھر کی ناک کٹوا دی۔ جھوٹی کہیں کی۔ خود جھوٹ بولتی ہیں اور ہم سے کہتی ہیں کہ جھوٹ نہ بولا کرو۔ "ابے تو پھر میری ناک کیوں ٹٹول رہا تھا؟" چچا جان گھبرا کر بولے اور مجھے غور سے دیکھنے لگے۔ میں نے کہا "میں سمجھا تھا کہ شاید پتھر کی ہے" انہوں نے پھر ایک چانٹا رسید کر دیا اور کہا۔ "اگر تم زرینہ کے گھر جاؤ گے تو اٹھا کر پٹخ دوں گا۔ دم نکل جائے گا۔" میں روتا ہوا باہر نکل گیا۔

مجھے بہت تعجب تھا۔ چچا جان کی ناک پتھر کی نہیں تھی اور میری ناک بھی ملائم ہے۔ پھر میں نے سوچا باجی زرینہ نے ہمارے گھر والوں کی ناک نہ کاٹی ہو۔ مجھے جو پیار کرتی ہیں۔ مگر اب تو وہ مجھ سے بولتی بھی نہیں ہیں۔ توند کیوں نکل رہی ہے ان کی؟ اماں انہیں گالیاں کیوں دیتی ہیں؟ بڑی خراب ہیں ان کی اماں۔ میں ابا سے کہوں گا کہ ان کی ماں کو بندوق مار دیں۔ شاید ابا میاں نے انہیں بندوق مار دی ہے۔ جب ہی تو آج کل دکھائی نہیں دیتے۔ اللہ میاں کے یہاں پہنچ گئے ہوں گے۔ دکھائی کیا دیں۔

میں ابا سے پوچھوں گا۔ شام کو وحید ملا۔ میں نے اس سے کہا کہ باجی زرینہ کو جادو کا ڈنڈا مل گیا ہے وہ کہنے لگا "وہ کیسے ......؟" میں نے کہا "پری نے دیا ہوگا۔

انہوں نے جادو کے ڈنڈے سے کہا ہو گا گاؤں بھر کی ناک کاٹ لو۔ مگر مجھے کسی کی بھی ناک کٹی ہوئی نہیں دکھائی پڑتی"۔

"میری اماں بھی کہہ رہی تھی کہ زرینہ نے سب کی ناک کٹوا دی۔ وہ تو یہ بھی کہہ رہی تھیں کہ زرینہ کے پیٹ میں بچہ ہے۔ حویلی والی خالہ کہنے لگیں کہ اختر نے بڑا کمینہ پن کیا ہے"۔ وحید بولا۔

میں نے کہا۔ "وہ کیسے؟"۔ یہ تو میں نہیں جانتا مگر سب کہتے یہی ہیں۔"
میں نے کہا۔ "سب جھوٹ کہتے ہیں، اختر چچا تو میرے چچا جان کے دوست تھے۔ واہ، وہ کیوں کمینہ پن کرنے لگے، وہ تو شریف آدمی تھے۔ کبھی ننگے ہو کر نہیں نہاتے تھے۔" وحید بولا "واہ، وہ پکے کمینے ہیں۔ انہوں نے ایک بار مجھے بڑے زور سے چانٹا مارا تھا۔" مجھے غصہ آگیا پر میں نے وحید کو کچھ نہیں کہا کیونکہ اس نے مجھے شیشے کی دوات دینے کو کہا تھا۔

کنگوا تیلی کمینہ پن کرتا ہے جو اپنی جورو کو پیٹتا ہے۔ اختر چچا تو بڑے شریف آدمی تھے۔ وہ کبھی ننگے ہو کر نہیں نہاتے تھے۔ نہ کسی عورت کو پیٹتے تھے۔ پر مجھے وہ اچھے نہیں لگتے تھے۔ مجھے یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی کہ باجی زرینہ کے پیٹ میں بچہ ہے۔ میں ان کے بچے کو خوب پیار کیا کروں گا۔ میں اس کے لئے میلے سے مٹی کے کھلونے لایا کروں گا۔ اسے گود میں لے کر ٹہلا کروں گا۔ مگر ان کا بچہ مجھے کیا کہے گا؟

میں نے چچی جان سے پوچھا، باجی زرینہ کا بچہ مجھے کیا کہے گا۔ اماں مجھے گھور کر دیکھنے لگیں۔ چچی جان ہنس کر بولیں "تمہیں ابا کہے گا اور کیا کہے گا۔" اماں نے جھنجھلا کر کہا "نوج ایسا بھی کیا مذاق" اور میری پیٹھ پر ایک گھونسا جڑ کر کہا "خبردار، اگر اب وہاں گیا تو ہاتھ پاؤں توڑ کر رکھ دوں گی۔"

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر یہ سب لوگ مجھے وہاں جانے سے کیوں روکتے ہیں۔ باجی زرینہ کیوں روتی رہتی ہیں۔ ان کی اماں انہیں گالیاں کیوں دیتی ہیں۔ توند

تو یوں نکل رہی ہے کہ ان کے پیٹ میں بچہ ہے۔ مجھے یاد آ رہا ہے کہ جب چچی جان کے پیٹ میں بچہ تھا تو ان کی توند بھی نکل آئی تھی۔ باجی زرینہ کا بچہ اگر سچ مچ مجھے ابا کہے تو کتنا اچھا ہو۔ میں اسے خوب پیار کروں۔ مگر جب میرا کہنا نہ مانے تو خوب پیٹوں۔ اسے کہوں کہ ننگے ہو کر نہانا برا ہے۔ شریف آدمی کے بچے ننگے ہو کر نہیں نہاتے۔

میں نے کئی دن سے باجی زرینہ کو نہیں دیکھا۔ میں رات کو دیر تک جاگتا رہتا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ میں نے کئی بار اپنے کوٹھے پر سے ان کے آنگن میں جھانکا مگر وہ نہیں دکھائی دیں۔ میں کیا کروں، میں کیا کروں؟ مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔ میں کیا کروں، میں کیا کروں!

وحید کہتا ہے چلو کوابیلیاں تلاش کریں۔ مگر میں نہیں جاؤں گا مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔ جی چاہتا ہے کہ چیخیں مار مار کر روؤں۔ پتہ نہیں باجی زرینہ کے گھر کا دروازہ بند رہتا ہے۔ کسی وقت نہیں کھلتا۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ کوئی نہیں بتاتا جس سے پوچھتا ہوں جھڑک دیتا ہے۔

باجی زرینہ کراہ رہی تھی۔ میں صاف سن رہا تھا۔ وہ شاید بہت زیادہ بیمار تھیں۔ لیکن ہمارے گھر سے کوئی انہیں دیکھنے نہ گیا۔ ابھی کل ہی تو رشید ماموں کے بچے کو تے ہو گئی تھی۔ ہمارے گھر کی سب عورتیں اسے دیکھنے گئی تھیں۔

آخر یہ سب باجی زرینہ کو دیکھنے کیوں نہیں جاتیں۔ مجھے وہاں کیوں نہیں جانے دیتیں۔ میں وہاں ہوتا تو ان کا سر دباتا۔ انہیں دوا پلاتا، جب وہ کراہتیں تو انہیں پیار کرتا اور کہتا "گھبراؤ نہیں تم بہت جلد اچھی ہو جاؤ گی۔ یا اللہ باجی زرینہ کو اچھا کر دے۔"

میں نے اماں سے پوچھا کہ باجی زرینہ کیوں کراہ رہی ہیں۔ انہوں نے جھلا کر کہا "خدا کا غضب نازل ہو رہا ہے۔ تجھے کیا چل بیٹھ اپنا کام کر" میں ڈر کر لحاف میں دبک گیا۔ خدا کا غضب نازل ہو رہا ہے۔ تب ضرور ابھی زمین ہلنے لگے گی۔ میں

لحاف میں تھر تھر کانپنے لگا۔ کہیں ہمارا گھر نہ گر پڑے۔

بہت دن ہوئے جب زمین ہلی تھی تو سب نے کہا تھا کہ خدا کا غضب نازل ہوا ہے اور دادا جان وغیرہ کہیں کی باتیں کیا کرتے تھے جہاں بہت سے مکان گر پڑے تھے اور زمین سے پانی نکل آیا تھا۔ مگر ہمارا گھر نہیں گرا اور نہ کوئی دھماکے کی آواز آئی مگر باجی زرینہ کیوں اور زیادہ چیخنے لگیں۔ کیا ان کا گھر گر گیا ہے مگر ابھی زمین بھی تو نہیں ہلی۔

اف، وہ پھر چیخیں، میں کیا کروں، ضرور ان کا گھر گر گیا ہے۔ یا خدا رحم کر۔ ارے چچا جان ہنس کیوں رہے ہیں۔ کیا یہ خدا کے غضب سے نہیں ڈرتے۔ ابھی زمین ہلے گی اور سارے مکان گر جائیں گے۔ زمین سے پانی نکل آئے گا۔ خدا کا غضب نازل ہو رہا ہے۔ باجی زرینہ اور زور سے چیخ رہی ہیں۔ چچی جان قہقہے کیوں لگا رہی ہیں۔

افوہ، یہ سب ہنس کیوں رہے ہیں۔ پھر باجی زرینہ کیوں چیخ رہی ہیں۔ کیا خدا کا غضب صرف انہیں پر نازل ہو رہا ہے۔ کیوں؟ آخر زمین کیوں نہیں ہلتی اگر یہ خدا کا غضب ہے تو مکانات کیوں نہیں گرتے۔ زمین سے پانی کیوں نہیں نکل پڑتا؟

میں جاگ پڑا بہت شور ہو رہا تھا۔ ارے یہ تو رونے کی آواز ہے۔ بہت سے لوگ رو رہے ہیں۔ ارے کیا مکانات گر گئے۔ کیا زمین ہل رہی ہے۔ مگر ہمارے گھر میں تو سب خاموش ہیں۔ سب جاگ رہے ہیں۔ ارے یہ سب بھی کیوں نہیں روتے۔ خدا کا غضب نازل ہو رہا ہے۔

کسی نے ہمارے دروازے کی زنجیر کھٹکھٹا کر کہا "زرینہ کا انتقال ہو گیا" قریب کی مسجد سے آواز آئی "اللہ اکبر، اللہ اکبر" کس نے کہا "ارے صبح ہو گئی" باجی زرینہ مر گئی...... ہائے باجی زرینہ...... میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ چچا جان نے ڈانٹا مگر میں روتا رہا۔ ہائے باجی زرینہ...... میرا دل چاہ رہا تھا روئے جاؤں۔ سب لوگ خاموش تھے...... باجی زرینہ کے گھر سے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ خالہ جان

بولی...... "اچھا ہی ہوا کہ مر گئی۔"

میرا دل چاہا کہ خالہ جان کا منہ نوچ لوں...... باجی زرینہ نے ان کا کیا بگاڑا تھا۔ کہتی ہیں اچھا ہوا مر گئی۔ ان کی بلی مر گئی تھی تو انہوں نے مہینوں افسوس کیا تھا۔ کیا باجی زرینہ اس بلی سے بھی بری تھیں۔ جو آئے دن منے کا دودھ پی جایا کرتی تھی۔ آخر باجی زرینہ نے کیا قصور کیا تھا سب انہیں کیوں برا کہتے ہیں؟ کوئی نہیں بتاتا، ہائے کوئی نہ بتائے گا۔

رسالوں کے اسرار

جنازہ نکالنے کی رسم عشاق کے ساتھ اٹھ گئی، ورنہ میں اسی پر زور دیتا، حالانکہ کسی رسم کو پھر سے بھی زندہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہاں عشاق کا خوف دامن گیر ہے اور پھر اب اس کی ضرورت ہی کیا ہے، جس مقصد کے لئے عشاق جنازہ نکالا کرتے تھے۔ اس کی تکمیل کے لئے اب دوسرے ذرائع بھی پیدا ہو گئے ہیں۔ مثلاً رسالہ نکالنا...... عشاق جنازہ نکالتے تھے، پروپیگنڈے اور چندے کے لئے، رسالہ بھی ...... مگر نہیں...... لاحول ولا قوۃ ...... ع

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ

لہٰذا جو کچھ جنوں میں بک چکا ہوں، اس کو باہوش و حواس ناظر کو جان کر واپس لیتا ہوں اور بصد خلوص عرض کرتا ہوں کہ رسالہ صرف ادب کی خدمت کے لئے نکالا جاتا ہے۔ اس لئے ہر اردو پڑھے لکھے آدمی کا فرض ہے کہ اپنی پہلی فرصت میں رسالہ ضرور نکالے اور دو چار شمارے نکال کر بند کر دے تاکہ دوسروں کے لئے میدان خالی ہو جائے اور دوسرے بھی داخل حسنات ہو سکیں...... اس کام میں امداد باہمی کا خاص خیال رکھنا چاہئے، اگر سب ہی بیک وقت رسالہ نکالنے لگیں گے تو کون خریدے گا اور کون پڑھے گا۔ اصول یہ ہونا چاہئے کہ آج میں رسالہ نکالوں، آپ خریدیں۔ اس کے بعد میں اپنا رسالہ بند کر کے آپ کا نکالا ہوا رسالہ خرید کر پڑھوں۔ اردو اسی طرح ترقی کر سکتی ہے، اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں۔

ہم میں بہتیرے ایسے ہیں جن کے اندر ادب کی خدمت کرنے کا جذبہ موجود ہے، لیکن وہ بے چارے رسالہ نکالتے ہوئے ہچکچاتے ہیں، جس کی وجہ غالباً ناتجربہ کاری ہے۔ لہٰذا میں رسالہ نکالنے کے چند موٹے موٹے اصول بتا کر اپنے فرض سے سبکدوش ہونے کی کوشش کروں گا۔

رسالہ نکالنے کے لئے سب سے پہلے جس دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، وہ رسالہ کے لئے ناموں کی کمیابی ہے۔ نام رکھتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہئے کہ اگر رسالہ معمولی اور سیدھا سادا ادبی اور فلمی رسالہ ہے تو نام منفرد ہونے چاہئیں۔ مثلاً لالٹین...... موم بتی...... پتنگا...... مچھندر...... خوشبو...... کرنیں...... لوٹا...... گلاس...... چمچہ...... چٹائی...... گل...... بلبل...... وغیرہ اگر رسالہ ترقی پسند ادبی رسالہ ہے تو ناموں کا مرکب ہونا ضروری ہے، یہ بھی واضح رہے کہ اگر نام کے ساتھ لفظ "نیا" نہ ہوگا تو سمجھ لیجئے رسالہ ترقی پسند نہ سمجھا جائے گا۔ لہٰذا نام اس قسم کے ہونے چاہئیں نیا کھڑاک...... نیا گلدان...... نیا اگال دان...... نیا شتر بے مہار...... نئی چٹنی...... نیا اچار...... نئی کھڑکی...... نیا دیدار...... وغیرہ وغیرہ۔

نام تجویز ہو جانے کے بعد سرمائے کا سوال آ پڑتا ہے۔ مالدار تو آسانی سے یہ مشکل بھی حل کر لیتے ہیں۔ لیکن غریب قسم کے خدام ادب کو سخت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ان کے لئے میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ وہ چندے سے کام نکالیں۔ دو چار صاحب ذوق قسم کے مال دار حضرات کو اپنا ہم خیال بنا کر انہیں ان کے فرض سے آگاہ کریں، اگر وہ اس پر بھی نہ مانیں تو ان کا نام ایڈیٹروں کی فہرست میں درج کر دینے کی دھمکی دیں۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ دھمکی سو فیصد کامیاب ہوگی۔

رسالے کا سرورق رنگین اور دیدہ زیب ہونا چاہئے۔ سرورق پر رسالے کا نام لکھوائیے اور کسی ایکٹرس کا سہ رنگا فوٹو چھپوائیے۔ پہلے صفحے پر ایڈیٹروں کے نام

اس انداز سے ترتیب دیجئے۔

ادارہ
سلیم الدین ہمدانی
شیخ چھتائی گلزار
میر کلو مجیر آبادی
بدھو پریم نگری
بیگم سلیمہ کریم بخش

اس قسم کی ترتیب سے ایک طرف تو آپ کے شرکاء کار بھی مطمئن ہو جائیں گے اور دوسری طرف پبلک پر خاطرخواہ رعب بھی پڑے گا۔

اب آیئے رسالے کے مواد کی طرف..... اس سلسلے میں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ آپ کو عوام کے مذاق کا خاص خیال رکھنا پڑے گا۔ اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ آپ عام وقتی اور دائمی رجحانات سے اچھی طرح واقف ہوں، اگر آپ ان سے واقفیت نہیں رکھتے تو آپ ایسا مواد پیش نہ کر سکیں گے جو عوام کے مذاق کے مطابق ہو، جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ دوسرے شمارے کی کتابت شروع ہوتے ہوتے ادارے میں صرف سلیم الدین ہمدانی کا نام رہ جائے گا۔

اور یہ ایسا ناخوشگوار انجام ہو گا کہ آپ دوبارہ کلرکی پر آمادہ ہو جائیں گے۔ لہٰذا بہت پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت ہے۔ اگر یہ دونوں کام آپ اکیلے نہ کر سکیں تو لیجئے میں ازراہ ہمدردی پھونکتا ہوں اور آپ قدم رکھئے۔ دیکھئے رجحانات دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وقتی اور ہنگامی اور دوسرا دائمی۔ وقتی رجحانات آپ کی کسی نہ کسی جبلت کی پیداوار ہوتے ہیں اور کسی حالت میں کبھی تبدیل نہیں ہوتے۔ مثال کے طور پر فلم دیکھنے اور محبت کرنے کو لیجئے۔ فلم آپ اسی وقت دیکھیں گے جب آپ کی

جیب میں پیسے ہوں گے۔ آپ کا یہ فلمی رجحان (INSTINCT OF LOVE) سے تعلق رکھتا ہے۔ لہٰذا آپ جب تک زندہ رہیں گے۔ عاشق ہوتے رہیں گے۔ کیونکہ مرتے دم تک جبلتوں سے پیچھا نہیں چھوٹتا۔

اب آیئے رسالے کی طرف وقتی رجحانات میں سے فلم اٹھا لیجئے حالانکہ فلم دیکھنا بھی آپ کے چند جبلی تقاضوں کی وجہ سے عمل میں آتا ہے۔ لیکن اسے دائمی نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ جب فلمیں نہیں تھیں تو آپ صرف مجرا سنتے تھے۔ اسی طرح جب فلمیں نہ ہوں گی تو آپ اپنی جبلی آسودگیوں کے لئے اور راہ نکال لیں گے، اس لئے یہ فلمی رجحان وقتی ہے۔ ہاں تو آپ اپنے رسالے کا کچھ حصہ فلم اور فلم سے تعلق رکھنے والی چیزوں کے لئے وقف کر دیجئے۔ فلم ایکٹریسوں کے حالات زندگی پر روشنی ڈالئے، اس کے لئے ایک مستقل عنوان قائم کر لینا زیادہ مفید سمجھا جاتا ہے۔ اس عنوان کے تحت میں جو مضمون لکھا جائے اس کو کم از کم کوزے میں سمندر کا مصداق ہونا چاہئے۔ نمونے کے لئے سطور مندرجہ ذیل عنوان ملاحظہ فرمایئے۔

شاید آپ نے نہ سنا ہو گا

کہ مس گوریا ڈاکٹر طوطا رام سے طلاق لے کر پہاڑی..... درہ دانیال سے شادی کرنے والی ہے۔

کہ مشہور رقاصا چنچلا دیوی ناشتے میں اونٹ کی مینگنیاں کھاتی ہیں۔

کہ کیرکٹر ایکٹر انور خان ڈائریکٹر نربدا پرشاد کے ماموں نہیں ہیں۔

کہ عوج بن عنق، شیخ لندھور بن سعد ان پروڈکشن کی پہلی پیش کش، ابن بطوطہ، میں بحیثیت ہیرو آ رہا ہے۔

کہ مہ جبین سکنجبین کی سگی بہن ہے۔

کہ چینا صبح شادی کرتی ہے اور شام کو طلاق لے لیتی ہے۔

کہ چینا چھینکتی بھی ہے۔

کہ چینا اپنے بچوں کو دودھ بھی پلاتی ہے۔

کہ چینا عنقریب مر جائے گی وغیرہ وغیرہ۔

سوال و جواب بھی عمدہ چیز ہے۔ اس کے لئے زیادہ سے زیادہ صفحات وقف کئے جائیں۔ کیونکہ جس کا سوال چھپتا ہے وہ ایک رسالہ ضرور خریدتا ہے، اگر سوالات موصول نہ ہوں تو خود سوال کیجئے اور خود ہی جواب لکھ ڈالئے۔ سوالات کا موصول نہ ہونا ہی اچھا ہے اگر سوالات موصول نہ ہوئے تو آپ کا سوال و جواب والا حصہ بہت ہی بلند پایہ اور معیاری ہو گا۔ آپ کی آسانی کے لئے چند سوالات اور ان کے جواب بطور نمونہ پیش کرتا ہوں۔

رضیہ بیگم پھپھوند

س۔ میں آپ کے رسالے کا بے چینی سے انتظار کیا کرتی ہوں بتایئے میں کیا کروں؟

ج۔ خریدار بن جایئے۔

س۔ ایڈیٹر صاحب! آپ کی عمر کیا ہے، حلیہ بھی تحریر فرمایئے۔

ج۔ بیس سال۔ حلیہ حسب ذیل ہے۔

رنگ سرخ و سپید، قد چھ فٹ تین انچ، سینہ ساڑھے تین انچ، آنکھ ایک بڑی اور ایک چھوٹی، بال گھنگریالے، ناک نہ بہت بڑی نہ بہت چھوٹی۔

س۔ کیا آپ اپنی تصویر بھیج سکتے ہیں؟

ج۔ مجبوری ہے، کیونکہ والد صاحب بہت خونخوار آدمی ہیں وغیرہ وغیرہ۔

اب آیئے افسانوں اور نظموں کی طرف۔ افسانوں اور نظموں میں عشقیہ مضامین ضروری ہیں۔ اگر نہ ہوں گے تو رسالہ کامیاب نہ ہو گا۔ وقتی تقاضوں، بھوک، روٹی اور مزدور وغیرہ سے ہمیشہ محفوظ رہئے اگر آپ انہیں رکھنا چاہتے ہیں تو صرف ایڈیٹوریل ہی تک محدود رکھئے اور جی بھر کر عوام عوام چلایئے، لیکن جہاں آپ نے افسانوں اور نظموں میں رونا شروع کیا، پرچا ٹھپ ہو جائے گا۔ دیکھئے میں آپ سے سچ سچ کہتا ہوں کہ اول تو مزدور پڑھے لکھے نہیں ہوتے اور اگر دو چار ایسے ہوتے بھی ہیں تو وہ ایم اسلم اور منشی ندیم صہبائی فیروز پوری کے ناول پڑھتے ہیں۔ کرشن چندر کے، ان داتا، میں ان کو بالکل مزہ نہیں آتا، یہ بالکل غلط ہے کہ کسی تحریر میں اپنی زندگی کی عکاسی دیکھ کر طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو بتایئے کہ آپ ہوائی قلعے کیوں بناتے ہیں۔ یقین جانئے کہ آپ افسانوں میں اپنے ہوائی قلعے دیکھ کر محظوظ ہوتے ہیں۔ کلرکی اور آٹے دال کا بھاؤ دیکھ کر نہیں۔

تو کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ عشقیہ مضامین کی بھرمار کر دیجئے کیونکہ عشق ہر پیرو جواں کا محبوب ترین مشغلہ ہے۔ ہر شخص مرتے دم تک عشق کرتا رہتا ہے یا پھر اس سلسلے میں ہوائی قلعے بناتا رہتا ہے۔

اگر آپ اپنے رسالے کو ضرورت سے زیادہ کامیاب بنانا چاہتے ہیں، تو اس میں عجیب و غریب معلومات سے متعلق ایک مستقل عنوان رکھئے۔ ہر شخص نئی نئی معلومات اور عجیب و غریب انکشافات میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لیتا ہے۔ یہ کوئی وقتی رجحان نہیں بلکہ یہ چیز شروع سے چلی آ رہی ہے اور قیامت تک قائم رہ گی۔ کیونکہ کھوج اور تجسس بھی ہماری ایک جبلت ہی تعلق رکھتے ہیں۔ ہاں تو آپ اس عنوان کے تحت میں اپنے پڑھنے والوں کو نئی نئی باتیں بتایا کیجئے...... نمونہ ملاحظہ ہو۔

کیا آپ جانتے ہیں کہ:۔

کہ شترمرغ شاعروں سے بہت محبت کرتا ہے۔
کہ راس کماری اور راج کماری کا درمیانی فاصلہ پانچ کروڑ پانچ سو پچھتر میل ہے۔

کہ گلہریوں میں شادی بیاہ کا رواج نہیں پایا جاتا۔
کہ مرغ مسلم نہایت لذیذ جانور ہے۔
کہ لومڑی سال میں تیس انڈے دیتی ہے۔
کہ کنگارو بہت فصیح اردو بولتا ہے۔
کہ جارج برنارڈ شا ضلع گورداس پور کے رہنے والے ہیں۔
کہ امردو چاہے جہاں پیدا ہو ہر حال میں الہ آبادی ہی کہلاتا ہے۔
کہ افریقہ میں ایک ایسی قوم پائی جاتی ہے جو سنسکرت کھاتی ہے۔
کہ نیویارک اب سے پانچ ہزار برس پہلے ہندوستان میں پایا جاتا تھا۔
کہ مہابھارت کی لڑائی میں ہوائی جہاز بھی استعمال کیے گئے تھے۔ جو مٹی کے تھے اور پارے کی بھاپ سے چلا کرتے تھے۔
کہ ڈی ویلرا پانچ سال پہلے الہ آباد کی ایک تحصیل میں نائب تحصیلدار تھے۔
کہ یہ رسالہ عنقریب بند ہونے والا ہے، اس لئے آئندہ سال کا چندہ بذریعہ منی آرڈر روانہ فرمائیے۔

اتنا کچھ تو سیدھے سادے ادبی اور فلمی رسائل کے کئے تھا۔ اب آئیے ترقی پسند رسائل کی طرف..... اگر آپ کوئی ترقی پسند رسالہ نکالنا چاہتے ہیں، تو آپ کو اتنی جھنجھٹیں نہ کرنی پڑیں گی، اس کے لئے ایک سیدھا سادا اصول بتائے دیتا ہوں کہ آپ اس میں سب کچھ چھاپ سکتے ہیں۔ لیکن اس کا ایڈیٹوریل ذرا زوردار ہونا چاہئے۔

ایڈیٹوریل لکھتے وقت خاص خیال رکھئے کہ تحریر میں فرائیڈ کا نام اور کارنامے کم از کم پچیس بار ضرور دہرائے جائیں..... اگر آپ ایڈیٹوریل میں، رسالے میں چھپنے والے مضامین پر تبصرہ بھی کر سکیں تو کیا ہی کہنا پھر تو آپ کا رسالہ ٹھوس قسم کا اور بلند پایہ ترقی پسند رسالہ سمجھا جائے گا۔ لیکن تبصرہ کرتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ ہر افسانے اور ہر نظم میں انسانیت کی چیخ اور نفسیاتی پس منظر کا وجود ثابت کرنا ضروری ہے، ورنہ تبصروں کی نہ کوئی اہمیت ہوگی اور نہ افسانوں ہی میں کوئی خاص بات پیدا ہو سکے گی۔ آپ کی آسانی کے خیال سے ایک ایڈیٹوریل بطور نمونہ لکھ رہا ہوں، غور سے ملاحظہ فرمائیے۔

ادب اور لاشعور

زمانہ کروٹوں پر کروٹیں لے رہا ہے، انقلاب آرہے ہیں، قدریں بدل رہی ہیں۔ ہمارا ادب بھی موجودہ بحران سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ موجودہ انتشار کے اثرات ہمارے ادب پر بھی چھا رہے ہیں۔ جس تحریر کو اٹھائیے، الجھن، بدحواسی اور پراگندگی وغیرہ کی آماجگاہ نظر آئے گی، قدامت دم توڑ رہی ہے، نئے افکار جنم لے رہے ہیں۔ آج دنیا کی نگاہیں مشہور ماہر نفسیات سگمنڈ فرائیڈ کی طرف ملتجیانہ انداز میں اٹھی ہوئی ہیں۔ اردو ادب بھی ان سے کچھ کہہ رہا ہے۔ ان کے قدموں پر عقیدت کے پھول چڑھا رہا ہے۔ اگر فرائیڈ نہ ہوتا تو ہم لاشعور سے یکسر محروم رہتے۔ فرائیڈ نے لاشعور کا پتا لگا کر ہم پر جو احسان کیا ہے اس کے بارے میں ہمارے منہ ہمیشہ گریبانوں میں رہیں گے۔ آج جدھر نظر اٹھاؤ لاشعور ہی لاشعور کا جلوہ نظر آتا ہے۔ چونکہ لاشعور ذہن کے اس عقبی حصہ کو کہتے ہیں جو بالکل تاریک ہے اس لئے جو حصہ بالکل تاریک ہے وہی لاشعور ہے۔ اکثر لاشعور اور شعور میں جنگ بھی ہو جاتی ہے جس کی بنا پر لاشعور

معدے میں چلا جاتا ہے، جس سے ہمیں بہت سے نقصانات پہنچتے ہیں۔ مثلاً خواب صاف نظر نہیں آتے اور اکثر اسی وجہ سے قبض بھی ہو جاتا ہے۔ شعور کو ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ وہ لاشعور سے لڑا بھڑا نہ کرے، یہ عادت اچھی نہیں ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ہم تحت الشعور سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ شعور اور لاشعور کی جنگ کو ہر ممکن طریقہ پر روکنے کی کوشش کرے۔ ورنہ اس سے اعصابی نظام کو خاطر خواہ دھکا لگنے کا اندیشہ پیدا ہو جانے کی امید بھی کی جا سکتی ہے اور نہیں بھی کی جا سکتی۔ ہمیں معتبر ذرائع سے اطلاع ملی ہے کہ شعور نے (SUPER EGO) کو بے طرح شہ دے رکھی ہے۔ جس کی بنا پر (SUPER EGO) نے ایک الگ پارٹی بنا کر لاشعور کی صاحب زادی (I.Q) کو دھمکیاں دینی شروع کر دی ہیں۔ یہ حد درجہ سفلہ پن ہے۔ بھلا لاشعور اسے کیونکر گوارا کر سکتا ہے۔ ہم شعور سے درخواست کریں گے کہ وہ (SUPER EGO) کو قابو میں رکھے، ورنہ بہت زیادہ خوشگوار نتائج پیدا ہو جانے کا امکان ہے۔ (SUPER EGO) اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا تو اردو ادب ضرورت سے زیادہ متقی اور پرہیز گار ہو جائے گا اور یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اس سے مولانائی نظام حیات کو کافی تقویت پہنچ جائے گی، جس کے لئے کوئی بھی ترقی پسند کسی قیمت پر تیار نہیں ہو سکتا لہٰذا میں ہر اس شخص سے جو اردو سے ذرا بھی لگاؤ رکھتا ہے، یہ استدعا کروں گا کہ وہ لاشعور پر شعور کو کسی طرح غالب نہ ہونے دے۔

کچھ اس شمارے کے متعلق

اس شمارے میں آپ کو نئے بھی ملیں گے اور پرانے بھی۔ پرانے سے مراد رجعت پسند نہیں بلکہ وہ ترقی پسند ہیں جو کافی مشہور اور کہنہ مشق ہو چکے ہیں۔ ان میں

کرم چندر کی ہستی محتاج تعارف نہیں۔ آپ کا افسانہ، امرود کا درخت، ایک بہترین تخلیق ہے۔ افسانہ پڑھ کر قاری یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے گا کہ اس افسانے کا عنوان، امرود کا درخت، کیوں ہے۔ بظاہر یہ ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جو اپنی بیوی کو رخصت کرا کر اپنے گھر لا رہا ہے۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اس افسانے کا ہیرو ایک امرود کا درخت نظر آئے گا۔ اگر خورد بین لگا کر معائنہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ امرود کے درخت سے مراد ہندوستان ہے...... اگر ہندوستان نہیں تو پاکستان ضرور ہے۔ اگر یہ دونوں بھی نہیں تو ایشیا کا کوئی اور ملک...... بہرحال اس افسانے کو امرود کے درخت پر بیٹھ کر پڑھئے تو زیادہ لطف آئے گا۔

فریدہ چلغوزہ آپ کو اس بار ایک نئے روپ میں نظر آئیں گی۔ آپ کا افسانہ ''کریلا اور نیم چڑھا'' سماج کی دکھتی ہوئی رگوں کے لئے نشتر ہے۔ اس میں ایک ایسی لڑکی کی نفسیات پر روشنی ڈالی گئی ہے جو خود کو تنہا محسوس کرتی ہے، اس لئے نیم پر چڑھ کر کریلا کھاتی ہے۔ فریدہ چلغوزہ نے کریلے کے روپ میں تلخیِ حیات کو جس انداز میں اجاگر کیا ہے، اس کی مثال ملنی دشوار ہے۔ فریدہ چلغوزہ کو فخر کرنا چاہئے کہ غیر ملکی ادیب ان کے خیالات چرا لیتے ہیں۔ فرانس کی مشہور ادیبہ میڈموزیل ویران مستقل طور پر ان کا تتبع کرتی ہے۔

زہر مہرہ خطائی اپنی بے پناہ مسکراہٹوں کے ساتھ اس بزم کو جگمگا رہی ہیں۔ آپ کا مزاح لطیف ''چھینکنے سے پہلے'' اپنی مثال آپ ہے۔ آپ کے انداز تحریر سے پتا چلتا ہے کہ اسٹیفن لیکاک نے آپ کے مزاحیہ مضامین کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔

تفضل حسین کا مقالہ شمارے کی جان ہے۔ آپ نے اس بار زراعت اور نفسیات جیسا کڈھب موضوع اٹھایا اور اپنے مقصد میں سو فیصدی کامیاب ہوئے ہیں۔ اردو میں اس قسم کے مقالات کم ہیں۔

حصہ نظم کو بھی آپ گوناگوں رجحانات اور نظریات سے مزین پائیں گے۔ شعرا میں شکیل قصائی کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ آپ کی نظموں میں ٹیس ہے، درد ہے، تڑپ ہے، آنسو ہیں، کراہیں ہیں، اور چیخیں ہیں۔ آپ مسکراتے بھی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے رونے کا ارادہ کر رہے ہوں۔ آپ کی نظم "ہائے پپیہا" اپنا جواب نہیں رکھتی۔

نمک سلیمانی اس بزم میں نووارد ہیں۔ لیکن وہ جو کچھ بھی لے کر آئے ہیں خوب ہیں..... اگر آپ غور سے دیکھیں تو ان کی نظم میں آپ کو ایک قسم کا مخروطی ابھار نظر آئے گا۔ نظم آہستہ آہستہ اٹھ کر نقطہ عروج تک جاتی ہے اور پھر نقطہ آغاز کی طرف پلٹ آتی ہے۔ اس الٹ پھیر نے جو بیضاوی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ اسے سمجھنے کے لئے وجدان صحیحہ کی ضرورت..... وغیرہ وغیرہ۔

ایڈیٹوریل بالکل اسی قسم کا ہونا چاہئے اگر آپ اسے اور زیادہ زوردار بنانا چاہتے ہوں تو شمارے میں شرکت کرنے والے حضرات کو غیر ملکی مصنفین کا حریف ثابت کرنے کی کوشش کیجئے۔ ٹالسٹائی کو، طالسطائی اور ٹامس ہارڈی کو طامس ہارڈی لکھئے۔ کیونکہ اردو کے حروف تہجی میں "ٹ" کا وجود بالکل نہیں پایا جاتا۔

رسالے میں ادارہ کی طرف سے ہر ماہ کچھ اعلانات بھی شائع کئے جائیں جو اس قسم کے ہوں۔

جواب طلب امور کے لئے دفتر تک آنے کی زحمت گوارا فرمائیے۔

اپنے مضامین کے پروف پڑھنے کے لئے خود تشریف لائیے، ورنہ ادارہ کتابت کی غلطیوں کا ذمے دار نہ ہو گا۔

مضامین پنسل سے لکھ کر روانہ کیجئے۔ اکثر مضامین خوشخط نہ لکھے ہونے کی وجہ سے اشاعت سے محروم رہتے ہیں۔

مضامین بلامعاوضہ نہیں شائع کئے جاتے، اس لئے مضامین کے ہمراہ مبلغ دس روپے بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمائیں صرف وہی مضامین قبول کئے جائیں گے جو منی آرڈر فارم کے کوپن پر لکھے ہوں گے۔

لیجئے، میں اپنے فرض سے سبکدوش ہو گیا۔ اگر آپ نے اب بھی رسالہ نہ نکالا تو حشر کے دن آپ سے سمجھ لوں گا۔

فرار

اور اب تو گدھے کو بری طرح غصہ آ رہا تھا...... پیچھا ہی نہیں چھوڑتے لونڈے کسی طرح...... کوئی پیٹ پر لاتیں جما رہا تھا۔ کوئی ایال تھام کر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کوئی دم اینٹھ رہا تھا۔ کوئی بلند آواز سے سوچ رہا تھا کہ اس کی دم میں کنستر باندھ کر ایک موٹا سا ڈنڈا رسید کر دیا جائے۔ ان انوکھی اور خطرناک تجویزوں پر اس کا دل لرز اٹھا...... اگر اس وقت اس کو دھوبی مل جاتا تو شاید وہ اس کا خون پی لیتا...... ایک تو دن بھر کی محنت لیتا ہے کبھی کبھار اگر موج میں آ کر چھٹی بھی دی تو اگلی ٹانگوں میں رسی باندھ دیتا ہے...... کوئی کہاں تک خشکہ کھائے۔ ہرا بھرا کھیت دیکھ کر طبیعت للچا ہی جاتی ہے۔ کھیت کی طرف کیا رخ کیا۔ موت کو دعوت دی...... کھیت والے سے بچ بھی جائے تو یہ لونڈے کہاں چھوڑتے ہیں...... کاش اگلی ٹانگیں...... بندھی نہ ہوتیں...... وہ دولتیاں جھاڑتا کہ مزاج درست ہو جاتے...... یکایک اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کئی لڑکے ایک ساتھ اس کی پیٹھ پر سوار ہو گئے ہوں اور ساتھ کسی موٹی سی مکھی نے بائیں آنکھ میں جہاں چیپڑ لپٹا ہوا تھا ڈنک مار دیا...... اس نے احتجاجاً اپنے بائیں کان کو جنبش دی اور دل ہی دل میں دھوبی کو گالیاں دینے لگا۔ "سور...... الو کا پٹھا...... ٹانگیں نہ جانے کیوں باندھ دیتا ہے...... باز آیا ایسی سیر و تفریح سے۔ مگر سیر و تفریح کیسی؟...... ہریالی بغیر تو زندگی اجیرن ہے...... صرف خشکے پر کیوں کر بسر ہو...... اس میں وٹامن کہاں...... کلوروفل کہاں؟ کئی بار کہا کہ بطور ڈیرنس الاؤنس ہری گھاس کا بھی اضافہ کر

دے...... مگر لال پیلی آنکھیں دکھا کر "ڈی۔ آئی۔ آر" کی دھمکی دیتا ہے حرامی...... سرمایہ دار کہیں کا...... الو کا پٹھا...... کلوٹا۔ کتا تو مزے اڑائے جو سالا گھر کا ہے نہ گھاٹ کا...... اور وہ جو دن رات خون پسینہ ایک کر کے اس کے ایوان مسرت کی بنیادیں رکھے۔ اس طرح خواری کی زندگی بسر کرے...... آخر نجات کیوں کر ہو؟ کیا کیا جائے...... اب نہیں سہے جاتے مظالم......۔

دفعتاً ایک تدبیر اس کے ذہن کے عقبی حصے سے شعور میں جھانکنے لگی...... کیوں نہ گدھوں کی ایک میٹنگ کال کر کے بالاتفاق آرا ایک جماعت کی بنیاد ڈالی جائے، ایسی جماعت جو اپنے حقوق کے لئے لڑ سکے۔ اپنے نمائندہ کا انتخاب کر کے آئین ساز اسمبلی میں اپنی آواز بھی پہنچا سکے...... اور وہ...... اس کا کیا پوچھنا...... تدبیر تو وہ سوجھی ہے کہ اگر کامیاب ہو گئی تو اس کا لیڈر بن جانا اتنا ہی یقینی ہے جتنا ایسی صورت میں دھوبی کا انتقال کر جانا۔ لیڈری کا خیال آتے ہی اس نے دونوں کان کھڑے کر لئے بالکل اسی انداز میں جیسے ایک لیڈر تقریر ختم کرنے کے بعد دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر داد وصول کرتا ہے۔...... اچانک ایک شریر لڑکے نے اس کے سر پر ایک موٹا سا لٹھ رسید کر دیا...... گدھے کی آنکھوں تلے اندھیرا آ گیا اور اس دھندلکے میں اسے بہت سی رنگ برنگی ساریاں سرسراتی نظر آئیں۔ ساریوں میں جھلکتی ہوئی نقرئی ٹانگیں رسیوں سے بندھی ہوئی تھیں...... دیکھتے ہی دیکھتے رنگین ساریاں ہری بھری گھاس میں تبدیل ہو گئیں...... ایک اور لٹھ پڑا...... گدھا جھنجلا اٹھا...... "نانسنس" اس نے پاس کھڑے ہوئے لڑکے سے کہا جو اپنے میلے کچیلے کرتے کی آستین سے بار بار ناک صاف کر رہا تھا۔ "بھلا میں ایسی صورت میں کیوں کر دوڑ سکتا ہوں جب کہ میری ٹانگیں بالکل بندھی ہوئی ہیں" لڑکوں نے آناً فاناً رسی کھول ڈالی...... گدھے نے "تھینک یو" کہتے ہوئے دولتی جھاڑی اور یہ جا وہ جا...... دیکھتے ہی دیکھتے لونڈوں کی

نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

کھائیاں اور نالے پھلانگتے پھلانگتے اس کی سانس پھول گئی تھی۔ شہر کی چوڑی سڑک نظر آتے ہی اس نے اپنی رفتار اس لئے دھیمی کر دی کہ کہیں کسی فوجی لاری سے ٹکر نہ ہو جائے۔ نہ جانے کیوں فوجیوں سے زیادہ اسے ان کی دیو ہیکل لاریوں سے ڈر لگتا تھا۔ ...... جن میں نہ حسن نہ رنگینی ...... بس بھرر بھرر کر کے فرائے بھرا کرتی ہیں..... اندھی کہیں کی..... اسے اپنی محبوبہ کا خیال آ گیا..... جس کی ایک ٹانگ انہیں اندھی لاریوں میں سے ایک کی نذر ہو گئی تھی۔ اس کی چیپڑ سے بجبجھاتی ہوئی آنکھوں سے دو آنسو نکل کر مکھیوں کی قطاروں کو درہم برہم کرتے ہوئے رخساروں پر ڈھلک آئے ..... ہائے رے مفلسی..... وہ اپنی محبوبہ کے لئے بیساکھیاں بھی تو نہ خرید سکا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے فورڈ موٹر فیکٹری کی موٹر ساز مشینوں کے پہیئے اس کے ذہن میں تیزی سے گردش کر رہے ہوں..... موٹریں بن رہی ہوں۔ اس کی محبوبہ کی ٹانگ میں یونین جیک لہرا رہا ہو..... مسٹر فورڈ بیساکھیوں کی مدد سے سڑک پر رینگ رہے ہوں.....

"دھب" سلسلہ خیال ٹوٹ گیا..... اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو ایک بڑی سی جغادری بھینس کھڑی سینگیں تولتی نظر آئی..... غالباً ان خیالات میں وہ بھینس سے ٹکرا گیا تھا۔

"ساری میڈم" گدھے نے سہم کر کہا۔

"ویٹس آل رائٹ" بھینس نے مسکرا کر کہا اور پاس کے کیفے میں گھس گئی۔

"الو کی پٹھی" گدھا زیر لب بڑبڑایا..... بڑا ناز ہے سینگوں پر سالی کو..... سینگ؟..... وہ خود بخود چونک پڑا..... اگر سینگ مار دیتی تو؟..... ایک وہ ہے سینگوں

سے محروم..... سینگوں کی عدم موجودگی ہی تو اس کی مظلومیت کا باعث ہے..... اگر سینگیں ہوتیں تو دھوبی بھی مساویانہ برتاؤ کرنے پر مجبور ہوتا..... اسے قدرت کی بےانصافی پر غصہ آ گیا..... بھینس، ایک ناکارہ سی جانور..... تھان پر بندھے بندھے دودھ دینے اور چارہ کھانے کے علاوہ اور کس کام کی ہے..... اس پر تشدد بھی تو نہیں ہوتا..... آخر اسے سینگوں کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے۔ اس غلط بخشی پر غصہ نہ آئے تو اور کیا ہو۔ بےانصافی کا یہ عالم ہے اور بنتے ہیں بھگوان..... اونہہ___ اس کے سینے میں بغاوت کا جوالا مکھی پھوٹ پڑا۔ قریب ہی خچر گاڑیاں جا رہی تھیں۔ کیا شاندار زندگی ہے ان کی وہ سوچنے لگا..... ایک وہ ہے دھوبی کا گدھا جو گھر کا بھی ہے اور گھاٹ کا بھی۔ مگر پھر بھی یہ حال کہ جہاں اب سے ایک ہزار سال پہلے تھا وہیں آج بھی ہے۔ آخر کیوں؟..... دھوبی محض دھوبی..... دھوبی ہی ان ساری ذلتوں کے ذمہ دار ہیں..... دھوبیوں کی خود غرضانہ اور سرمایہ دارانہ ذہنیت نے اس کی قوم کو آگے نہ بڑھنے دیا___ وہ گڑبڑا گیا___ ایک نوجوان خچرنی اسے آنکھ مار رہی تھی..... اس کے ذہن میں غالب کا شعر گونج اٹھا۔

سادگی و پرکاری بیخودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرات آزما پایا

لفٹ تو مل رہی ہے، اس نے سوچا، کیوں نہ اس سے رومانس لڑایا جائے۔ اف یہ صاف شفاف آنکھیں..... چمکدار سڈول بدن..... گدرائی ہوئی ٹانگیں......

اور کیا چاہئے محبت میں

.....اس نے اسی گاڑی کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیا۔ جس میں وہ خچرنی جتی ہوئی تھی۔ خچرنی کا پارٹنر گردن اکڑائے ہوئے بڑی شان سے چل رہا تھا۔ وہ ایک

زبردست خچر تھا۔ اسے دیکھ کر گدھے کو احساس کمتری ہونے لگا اور خوف بھی معلوم ہونے لگا کہ کہیں پٹائی نہ کر بیٹھے۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ کہیں خچرنی احمق تو نہیں بنا رہی، بھلا اس خچر کے سامنے اس کی کیا ہستی ہے۔ مگر پھر یہ سوچ کر کہ محبت دو روحوں کے اتصال کا نام ہے نہ کہ دو جسموں کے اتصال کا نام۔ اس نے اپنے دل کو ڈھارس بندھائی اور خود بھی ماڈرن فاکس ٹراٹ کی دھن میں سیٹی بجاتا ہوا اکڑ اکڑ کر چلنے لگا......

"اوہ!...... ویری سویٹ" خچرنی نے اس کی طرف سر گھما کر آہستہ سے کہا۔

"شرمندہ کر رہی ہیں آپ" گدھے نے سیٹی روک کر لجاتے ہوئے کہا۔

"نہیں واقعی ہو بہو وہی اسٹائل ہے...... کیا آپ پرسوں فیریز رنگ میں تھے؟" خچرنی بولی۔

"وہاں تو میں ہر ہفتہ جاتا ہوں"۔ گدھے نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ میں نے آج تک کوئی پروگرام مس ہی نہیں کیا"۔

"اوہ! ڈلائٹڈ تو میٹ یو"۔ خچرنی نے جلدی جلدی پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔

خچرنی کے پارٹنر نے دم اٹھا کر چند غصیلی آوازیں نکالیں۔ اس پر خچرنی نے اس کی طرف دیکھ کر اس طرح آنکھ ماری گویا گدھے کو الو بنا رہی ہو...... اس کے پارٹنر نے مسکرا کر دم نیچے کر لی۔

"کیوں نہ ہم لوگ آرلکچنو میں چل کر ایک ایک گلاس شیری پئیں" گدھے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نو تھینکس" خچرنی نے سادگی سے جواب دیا۔ "میں اس وقت بہت بڑی

ہوں۔ البتہ کل اسی وقت وہاں مل سکوں گی"۔

"رہی" گدھے نے کان ہلاتے ہوئے کہا۔

"قطعی" خچرنی بولی۔

"چیریو"

"چیریو"

خچر گاڑیاں ایک طرف ہولیں___ گدھا اس وقت تک وہاں کھڑا رہا جب تک کہ وہ دوسری طرف نہ مڑ گئیں۔

کل کی شام ایک حسین شام ہے، وہ سوچنے لگا۔ مگر حیرت تو اس پر ہے کہ وہ خواہ مخواہ اس کی طرف متوجہ ہی کیوں ہوئی۔ اور پھر وہ تحسین آمیز انداز گفتگو۔ ضرورت ہی کیا ہے کہ اس موضوع پر کچھ سوچا جائے۔ اس سے کیا غرض کہ ایسا کیوں ہوا...... بہرحال ہوا...... آج کی مشغول دنیا میں "کیوں" کا سوال اتنا ہی دقیانوسی ہے جتنا کہ اس خرابے کا نام دنیا ہی کیوں رکھا گیا۔

...... آموں کی اس مقدار سے مطلب جو پیٹ کی نذر ہو رہی ہے نہ پیڑ گننے سے

"بڑے مگن نظر آرہے ہو"۔ پیچھے سے آواز آئی۔

وہ چونک پڑا۔ اس کا حریف دھوبی کا کتا زبان نکالے کھڑا ہانپ رہا تھا۔

"جی"۔ گدھے نے روکھے پن سے کہا۔

"کچھ ناراض معلوم ہوتے ہو"۔ کتا مسکرا کر بولا۔

"جی ہاں...... پھر؟" گدھے نے کتے کو تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"مزاج درست ہیں یا نہیں"؟ کتے نے دم ٹیڑھی کرتے ہوئے کہا "نہ

جانے خود کو کیا سمجھتے ہو"۔

"دیکھو مجھ سے تمیز سے بات کیا کرو...... کئی بار سمجھا چکا ہوں" گدھا تیزی سے بولا۔

"اچھا؟" اب کتے کی دم اس کی کمر پر دائرہ بنا رہی تھی اور نچلے جبڑے کی کوریں تھرتھرانے لگی تھیں۔ غراہٹ آہستہ آہستہ بلند ہو رہی تھی۔ قبل اس کے کہ وہ گدھے پر جھپٹے ایک بڑے موٹے انگریز کا گرے ہاؤنڈ اس پر جھپٹ پڑا۔ دھوبی کے کتے کی دم سیدھی ہو گئی اور آہستہ آہستہ پچھلی ٹانگوں سے گذرتی ہوئی پیٹ سے جا لگی۔ پچھلی ٹانگوں کے بل جھکتے ہوئے اس نے اپنے دانت نکال دیئے۔ گنجے انگریز نے پلٹ کر سیٹی بجائی اور گرے ہاؤنڈ دھوبی کے کتے کی دم سونگھ کر پھر اس کے پیچھے ہو لیا۔

"پردیسی سمجھ کر چھوڑ دیا ورنہ ...... دھوبی کے کتے نے جھینپ مٹانے کی کوشش کی۔

گدھے نے قہقہہ لگایا۔ "بہت اچھا کیا"۔

"چھوڑو بھی"۔ کتے نے کہا "چلتے ہو کہیں"۔

"کہاں"

"ذرا دریا کی طرف" کتا پچھلی ٹانگ سے پیٹ کھجلاتا ہوا بولا. "میں تو اکتا گیا ہوں ان آبادیوں سے"۔

"بس کرم کیجئے ...... بڑی مشکل سے جان بچا کر آیا ہوں"۔ گدھے نے دائیں ٹانگ کے اوپری جوڑ پر کی کھال کو ذرا سی جنبش دے کر کہا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب صاف ہے۔ ہماری قوم بہت ہی امن پسند ہے۔ ایک گدھا آج تک

کسی دوسرے گدھے کے لئے مہلک ثابت نہیں ہوا۔ اور نہ کبھی کسی گدھے نے یہ کوشش کی کہ دوسرے پر اپنی برتری کا رعب ڈالے، ہم سب برابری اور بھائی چارے کے قائل ہیں۔ ہم سب وہی کھاتے ہیں جو ایک کھاتا ہے۔ ہم سب کڑی محنت کے عادی ہیں۔ اونچ نیچ کے جراثیم سے ہماری قوم ہمیشہ پاک و صاف رہی ہے......"

"ذرا ٹھہرو" کتے نے بار بار اپنی آنکھ پر حملہ کرتی ایک مکھی کو ہڑپ کرتے ہوئے کہا "آخر اس لیکچر کا مطلب؟ تم ہمیشہ سے چھیڑ چھیڑ کر لڑتے چلے آئے ہو...... ان ساری باتوں کا مفہوم سوائے میری قوم کی تذلیل کے اور کیا ہو سکتا ہے؟...... مجھے تسلیم ہے کہ میری قوم ان تمام خوبیوں کے مخالف نقائص کی حامل ہے مگر تمہیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ ہم اس کے لئے مجبور ہیں۔ کچھ قدیم روایات اور کچھ تقاضائے فطرت کی بناء پر ہم آج تک اپنی ان عادات سے پیچھا نہ چھڑا سکے...... تکلف بر طرف سچ پوچھو تو ہمارے لئے باعث فخر ہیں۔ باعث فخر اس لئے کہ یہ نظام فطرت کے عین مطابق ہیں...... کیونکہ نظام قدرت ہی ہمیں "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کا سبق دیتا ہے۔ رہا بھائی چارہ والا معاملہ تو یہ سب بناوٹ اور جھوٹ ہے...... اس قسم کا کوئی نظام کبھی دیرپا ثابت نہیں ہوا جو نظام قدرت کے خلاف ہو۔ بھائی چارہ قسم کی تحریکیں عارضی اور وقتی ضرورت کی ایجاد ہیں اور......"

"اماں پوری بات تو سنی ہوتی تم تو بیچ ہی سے لے اڑے...... میں اس وقت بالکل سیاسی گفتگو کے موڈ میں نہیں ہوں۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ میری قوم میرا حریف نہیں پیدا کر سکتی...... میرا حریف اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ صرف انسان ہے اور دریا کی طرف لہلہاتے ہوئے کھیتوں کے درمیان اس حریف کا سامنا یقینی ہے۔ کیونکہ وہاں پہنچ کر میرے لئے اپنے فطری حق کے لئے جدوجہد ضروری ہو جائے گی...... فطری حق سے میری مراد ہریالی ہے...... اور یہ تم جانتے ہی ہو کہ حق طلبی اور لاٹھی چارج میں کچھ

زیادہ فاصلہ نہیں ہوتا...... تف ہے...... خدا دشمن کو بھی انسان نہ بنائے اس سے تو کتے ہی بھلے"......

"دیکھو دیکھو تم نے پھر وہی چھیڑ چھاڑ شروع کی" کتے نے کہا۔

"تم تو ہو نرے آدمی" گدھا گردن جھٹک کر بولا "ارے بابا میرا مطلب یہ ہے کہ مجھے انسانوں سے زیادہ کتے پسند ہیں"۔

"خیر...... مارو گولی...... چلنے کی کیا رہی" کتے نے چاروں ٹانگیں آگے پیچھے پھیلا کر ایک طویل انگڑائی لی۔

"کہہ تو دیا"۔ گدھے نے لاپروائی سے کہا۔

"اس کی فکر نہ کرو" کتا بولا "اگر تمہاری طرف کسی نے آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو اس بری طرح کاٹوں گا کہ سالا پاگل ہی ہو کر مرے گا"۔

"یہ بات؟ تو آؤ" گدھے نے اپنے بائیں پہلو پر دم رسید کرتے ہوئے کہا۔

دونوں آہستہ آہستہ دریا کی طرف چل پڑے۔ راستہ بھر تفریحی گفتگو ہوتی رہی۔ گدھے نے کتے کو آج والے معاشقہ کی داستان خوب مزے لے لے کر سنائی۔ کتا راستہ بھر کتیوں کو دیکھ دیکھ کر دانت پر دانت جمائے "کوں کوں" کرتا رہا۔ گدھا اس کی اس حرکت پر اسے ڈانٹتا جا رہا تھا۔

"تمہاری یہی لوفرٹی تو مجھے ناپسند ہے"۔

"واہ بیٹا...... تم کرو تو عاشق اور میں کروں تو لوفر کہلاؤں...... آ گئے نا اصلیت پر؟...... ارے صاحب زادے پھر کہتا ہوں کہ یہ برابری اور بھائی چارہ سب ڈھونگ ہے۔ اس وقت تم نے بالکل آدمیوں جیسی حرکت کی ہے۔ آدمیوں میں رہ کر تم کسی طرح اپنا گدھاپن برقرار نہیں رکھ سکتے...... کچھ نہ کچھ آدمیت آ ہی جائے گی...... ان

حضرت انسان کا بھی عجیب حال ہے۔ اگر کسی رئیس کی لڑکی کسی مرد کے ساتھ جنسی تعلق قائم کر لیتی ہے تو محبت کرنے والی کہلاتی ہے۔ اگر کوئی غریب لڑکی اس فطری تقاضے کو روکنے میں کامیاب نہ ہوئی تو جانتے ہو وہ کیا ہو جاتی ہے؟...... وہ کہلاتی ہے "آوارہ اور آبرو باختہ"۔

"اونہہ" گدھے نے کان ہلا کر کہا، "پھر بور ہونے لگے ــــ سنو میں نے ایک بلینک ورس کہی ہے۔ دونوں دریا کے کنارے سرسبز کھیتوں میں پہنچ چکے تھے۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ گدھے نے موقع مناسب جان کر منہ مارنے شروع کئے۔ خوش قسمتی سے کتے کو بھی قریب ہی ایک بکری کے بچے کی سڑتی ہوئی لاش دستیاب ہو گئی۔

"ہاں وہ تمہاری نظم کا کیا ہوا...... سنا چلو" کتے نے قریب بیٹھے ہوئے گدھوں اور کوؤں کو دھمکی دے کر بڑی سی بوٹی نگلتے ہوئے کہا۔

"ہوں...... سنو" گدھے نے سر ہلا کر منہ چلاتے ہوئے کہا "نظم کا عنوان ہے "فرار"

سرمئی رات ابھی اور بھی کجلائے گی
یہ بھی ممکن ہے کہ تاروں کی یہ افشاں اے دوست
وقت کی زلف سیہ تاب سے اکتائی ہوئی
رسمساتی ہوئی بوندوں کی طرح ڈھل جائے
یہ بھی ممکن ہے کہ شبنم کے دہکتے موتی
بحر اسود کے اچھلتے ہوئے قطرے بن جائیں

پر یہ ممکن نہیں اس سرد و سیہ رات میں اب

اپنے نغموں سے فضاؤں کو نہ بیدار کروں
کیا یہ ممکن ہے کہ طبلے کی دھمک پر اے دوست
ایک رقاصہ کے پائل کی چھنک چپ رہ جائے
کیا یہ ممکن ہے کہ ساون کی گھٹاؤں کے تلے
ایک میخوار کی توبہ سلامت رہ جائے

یہ سیہ رات ہے مضراب مجھے چھیڑتی ہے
اور میں ساز ہوں نغمات بکھیروں گا ضرور
میرے نغموں کے تلاطم سے مجھے کہنے دو
ایک چلمن سی سرک آتی ہے غمخانوں پر
سونے والوں کو جگا دیتے ہیں نغمے میرے

نیند اچٹ جائے جسے سن کے وہی ساز ہوں میں
ہاں مگر اپنے لئے، اپنے لئے، اپنے لئے
ایک افیون ہوں دشمن ہے جو بیداری کی
کاش چھن جائے یہ احساس گراں مجھ سے کہ میں
ایک درماندہ مسافر ہوں تھکن کا مارا
راہ رو ڈال دیا کرتے ہیں جس پر اے دوست
بوجھ اپنی بھی تھکن کا یہ ستم کیا کہئے

اب یہ سوچا ہے کہ اڑ جاؤں افق کے اس پار

مرغزاروں میں حسیں کھیتوں، چراگاہوں میں
جن میں سوئی ہوئی اک جھیل بلاتی ہے مجھے
جس کے سینے میں پرندوں کے لچکتے سائے
اک حسیں جال سا بنتے ہی رہا کرتے ہیں

تاڑ کے پیڑ کنارے پہ سکوں میں ڈوبے
اپنی تصویر کا دیدار کیا کرتے ہیں
نارسی سس ۔ بھی جنہیں دیکھ کے اے دوست نہ پوچھ
یوں خجل ہو، کہ کبھی حسن کا دعویٰ نہ کرے

کوئی زنجیر گراں روک نہ پائے گی مجھے
لو چلا، میں یہ چلا، میں یہ چلا، میں یہ چلا!!!

"بہت خوب!" کتے نے لاش کو جھٹکوں کے ساتھ ادھیڑتے ہوئے کہا۔

"مکرر ارشاد"

"پھر وہی رسمی اور دقیانوسی باتیں" گدھے نے چیں بہ چیں ہو کر کہا "کیا تم نے مجھے بھی کوئی مشاعرہ کا شاعر سمجھا ہے......

گدھا سر جھکا کر چرنے کا سلسلہ دوبارہ قائم کرنے ہی جا رہا تھا کہ ایک بھناتا ہوا لٹھ ایک ناقابل تحریر جوابی بلینک ورس کے ساتھ اس کے سر پر پڑا۔

"ارے باپ رے باپ" کہہ کر گدھے نے چھلانگ لگائی۔ کتے کے منہ سے بلبلاہٹ بلند ہوئی۔ اچھلتے وقت گدھے کی ٹانگیں اس کے سر پر پڑی تھیں۔

"ٹھہرو تو جانا" کتے نے گدھے کے پیچھے دوڑتے ہوئے کہا "وہ تو میں جانتا ہی

تھا کہ تیرے دل میں کینہ ہے کتنا ہی محبت کا برتاؤ کروں۔ پر تیرے دل سے دشمنی کی لکیر نہیں مٹ سکتی۔ اچھا بیٹا کھال نہ کھینچ لی ہو تو سہی ..... جاتے کہاں ہو؟"

گدھے پر بدحواسی طاری تھی بغیر کچھ کہے ہوئے اپنی پوری قوت سے دوڑ رہا تھا ..... غلط فہمی نے کتے کو بھی اس کا دشمن بنا دیا تھا..... وہ سوچ رہا تھا کہ اگر آدمی کے لٹھ سے بچ بھی گیا تو یہ کتا کب چھوڑتا ہے۔ افق میں بڑھتی ہوئی دھندلاہٹ نے دونوں کو اپنے دامن میں چھپالیا۔

۱۔ نارسی سس یونان کا ایک حسین لڑکا۔ اتفاقاً ایک دن ایک جھیل میں اپنا سایہ دیکھ کر خود پرستی کا شکار ہو گیا۔ ایک عرصہ تک بے آب و دانہ وہیں کھڑا اپنے سائے کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہا اور وہیں اس کی موت واقع ہو گئی کچھ دن بعد اسی جگہ ایک پودا اگ آیا جسے (NORCESSUS) یا نرگس کہتے ہیں۔ (یونانی دیو مالا)

حقوق و فرائض

آپ کا پیدائشی حق ہے کہ مجھے جی بھر کے مغلظات سنائیں اور میرا اخلاقی فرض ہے کہ میں خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کروں۔ اگر ایسا نہیں کرتا تو مدنیت (Civics) سے بالکل ناواقف اور اس قابل ہوں کہ عبرت کے لئے کسی چڑیا گھر کے کٹہرے میں بند کر دیا جاؤں۔ جہاں بوڑھے تماشبین مجھے دور سے اپنی چھڑیاں دکھائیں اور بچے مونگ پھلی کے چھلکے میری طرف پھینکیں۔ اس وقت بھی میرا اخلاقی فرض یہ ہو گا کہ بوڑھوں کو جھک جھک کر سلام کروں اور بچوں کو دعائیں دوں۔ اس کے بجائے اگر کوئی دوسرا فعل مجھ سے سرزد ہوتا ہے تو پھر پاگل خانے کے علاوہ اس وسیع دنیا میں میرے لئے کوئی اور جگہ نہیں۔

میرا اخلاقی فرض ہے کہ رسائل کے لئے نہ صرف بلامعاوضہ مضامین لکھوں بلکہ ان کے لئے خریدار بھی مہیا کروں اور ہر "خاص نمبر" دیکھ کر تعریفی خطوط لکھوں۔ اڈیٹر صاحبان کا پیدائشی حق ہے کہ مضمون ناپسند ہونے پر اسے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیں۔ وہ بھی اس لئے کہ مضمون اپنی نالائقی کی بناء پر اپنے ہمراہ چھ پیسے کا ٹکٹ لانا بھول گیا تھا۔ میرا اخلاقی فرض ہے کہ اڈیٹر صاحبان کی قابلیت اور محنتوں کے قصیدے بطرز "قوالی" پڑھتا پھروں اور ان کا پیدائشی حق ہے کہ وہ مجھے اس کے صلہ میں ترقی پسندوں کا باوا آدم بنا دیں۔ ابھی کل ہی کی بات ہے میں نے ایک اڈیٹر صاحب کو "نک چڑھا" کہہ دیا تھا۔ بس پھر کیا تھا برس ہی تو پڑے کہنے لگے

"جاہل ہو، جاکر نفسیات کا مطالعہ کرو" ..... چنانچہ بارہ گھنٹے تک نفسیاتی تجزیہ کرتا رہا کہ ان کی ناک ٹیڑھی کیوں ہے..... بڑی مشکل سے سمجھ میں آیا کہ ان کی محبوبہ ان کی ناک تھام کر جس طرف گھما دیتی ہے تقریباً چھ ماہ تک ان کا منہ ادھر ہی رہتا ہے..... تحقیق کرنے سے پتہ چلا کہ انہیں اڈیٹری کی راہ پر لگانے والی ان کی محبوبہ ہی تھی۔ یہ تو جملہ معترضہ تھا..... مطلب یہ ہے کہ میرا اخلاقی فرض یہ بھی ہے کہ اڈیٹر صاحبان کے حسن کی بھی تعریف کروں ورنہ جاہل بھی ہوں اور نفسیات سے بے بہرہ بھی ..... بہرحال قدم قدم پر اخلاقی فرائض اور پیدائشی حقوق کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

میرے پڑوسیوں کا پیدائشی حق ہے کہ وہ دو بجے رات تک "قوالی" کرتے رہیں اور میرا اخلاقی فرض ہے کہ کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر سونے کی کوشش کروں ..... اور صبح اٹھ کر مسکرا کر ان سے کہوں "واللہ کیا کیا قوالیاں ہوئیں..... مگر وہ قوالی کیوں نہ ہوئی؟ میرے مولا بلا لو مدینے مجھے۔

اگر میں ناکام محبت یا ادیب ہوں تو میرا اخلاقی فرض ہے کہ خوب دل کھول کر شراب پیوں اور طوائفوں کے کوٹھوں کے چکر کاٹوں اور ایسا نہیں کرتا تو آپ کا پیدائشی حق آپ کو یہ کہنے پر مجبور کر دے گا کہ میری پچھلی سات پشتوں میں نہ کسی نے محبت کی ہے اور نہ کوئی ادیب ہوا ہے اور آئندہ نسلوں میں نہ محبت کرنے کی صلاحیت ہو گی اور نہ ادیب بننے کی۔ .....

اگر میں آپ سے عمر میں چھوٹا ہوں تو میرا اخلاقی فرض ہے کہ آپ کو سلام کروں اور آپ کا پیدائشی حق ہے کہ آپ مجھے سلام نہ کریں کیونکہ رسول اللہ ؐ بچوں کو سلام کیا کرتے تھے۔

اگر میرا کوئی بزرگ مجھ پر بے جا الزام لگائے تو میرا اخلاقی فرض مجھے خاموش رہنے پر مجبور کر دے گا۔ ورنہ الزام کی تردید کے سلسلہ میں میرے بزرگ کا پیدائشی

حق مجھے نالائق قرار دینے پر مجبور ہو جائے گا۔

میرا اخلاقی فرض ہے کہ ہر ملنے والے سے خواہ مخواہ پوچھوں "آپ کے کتنے بچے ہیں..... ان میں کتنے بالغ ہیں اور کتنے نابالغ، کتنے مختون اور کتنے غیر مختون..... کتنے دودھ پیتے ہیں اور کتنے انتظار کر رہے ہیں، بچوں کی ماں کیسی ہیں؟ اگر بیمار ہیں تو علاج کس کا ہو رہا ہے اور کب تک مر جانے کی امید ہے..... بچے اسکول جاتے ہیں یا خیراتی ہسپتال۔ بچوں کی نانی اماں کی کیا عمر ہے، ان کے دانتوں کے درد کا اب کیا حال ہے..... انہیں "ڈونگرے کا بال امرت" استعمال کرائیے۔ کون سا ہیر آئل استعمال کرتے ہیں آپ؟ پتاخہ ہیر آئل؟ بھئی واللہ کمال کر دیا۔ آج کل تو بہت مہنگا ہو گا، آپ چرخہ ہیر آئل کیوں نہیں استعمال کرتے..... وغیرہ وغیرہ۔ اگر میں نے اتنی بکواس کرنے کے بجائے صرف "مزاج شریف" پر اکتفا کی تو اس ملنے والے کا پیدائشی حق ہے کہ وہ مجھے مغرور کہہ دے۔

میرا اخلاقی فرض ہے کہ اپنے ہر عزیز کے چھ ماہ کے صاحب زادے کو جھک کر آداب کروں، ان کی مزاج پرسی کروں، انہیں اپنی ڈاڑھی پکڑنے دوں..... ان کے سامنے طرح طرح کے منہ بنا کر "میاؤں میاؤں" کروں، ان کے سامنے سیٹیاں بجا کر قلابازیاں کھاؤں..... ان کی "غوں غا....." اس طرح کان دھر کر سنوں جیسے کسی لیڈر کا لیکچر سنتا ہوں۔ ان کی ننھی منی ٹھوڑی اپنی انگلی سے سہلاتے ہوئے تتلا تتلا کر کہوں "للا ہے..... منا ہے..... بیٹا ہے..... بھیا ہے..... سور کا بچہ ہے..... الو کا پٹھا ہے....."۔

اگر اس کے علاوہ اور کوئی رویہ اختیار کیا گیا تو میرے عزیزوں کا پیدائشی حق ہے کہ وہ مجھے مدمغ کہہ کر ناک بھوں سکوڑ لیا کریں.....؟

میرا اخلاقی فرض ہے کہ اپنے دوستوں کی چیزوں کی تعریف کروں۔ انہیں راہ

چلتے روک کر کہوں " آج تو بہت جچ رہے ہو، یہ سوٹ کہاں سے سلوایا؟ کپڑے کا کیا کہنا اب تو آنکھ میں لگانے کو بھی نہیں ملتا۔ اوہ یہ گھڑی ...... رومر ہے کیا؟ بھئی اب تو یہ مارکیٹ میں ہے بھی نہیں ــــ ایک سو بیس میں خریدی تھی؟ ...... آج کل شاید تین سو میں بھی نہ ملے ــــ بڑے غضب کی مہک ہے ...... کون سا لونڈر استعمال کرتے ہو...... اوہ "ڈھمپوڈی کھاچ کھاچ" ؟ بھئی میں تو ترس گیا اس لونڈر کو ...... کہاں سے منگوایا تھا؟ ...... یار مجھے بھی منگوا دو ایک عدد ...... جوتا پہنے تو تمہاری پسند سے ...... کتنا کھل رہا ہے ...... اگر یہی تمہاری چندیا پر پڑے تو کیسی رہے ــــ اوہ یہ خوشرنگ ٹائی !!! ــــ کاش یہ تمہاری دم میں بندھی ہوتی ...... نہ ہوئیں تمہارے سر پر سینگیں ورنہ تمہارے گلے میں ایک عدد گھنٹی باندھ دیتا ...... وغیرہ وغیرہ۔ اگر اس وقت اتفاق سے میرا "اخلاقی فرض" موڈ میں ہوا تو بس سمجھ لیجئے کہ میرے دوستوں کا "پیدائشی حق" مجھے خود پسند کہہ بیٹھے گا۔

بہرحال ہماری دنیا میں اخلاقی فرائض اور پیدائشی حقوق کسی نہ کسی صورت میں ہمیشہ موجود رہے ہیں۔ پروٹوزوا سے لے کر انسان تک اور اس کے بعد ڈارون سے لے کر شیخ چلی تک سبھی اخلاقی فرائض اور پیدائشی حقوق میں "مبتلا" نظر آتے ہیں۔ اگر اخلاقی فرائض اور پیدائشی حقوق ہوتے تو آج انسان تپ دق سے محروم رہتا اور ہاتھیوں کو گنے کی شراب نہ ملتی۔ تپ دق کے جراثیم سے لے کر ہاتھی تک سبھی حیوانات ارتقائی منزلیں طے کر رہے ہیں۔ مگر ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ یہ سب اخلاقی فرائض اور پیدائشی حقوق کے زیر نگرانی ہو رہا ہے ...... جراثیم کے پیدائشی حقوق اور پھیپھڑوں کے اخلاقی فرائض میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ بالکل ویسا ہی جیسا ادب اور زندگی کا ہے ...... ہاتھیوں کو گنے کی شراب پلانے کے اخلاقی فرض کی تاریخ کا پتہ پورس کے زمانے کے بعد سے نہیں ملتا۔ جس کی وجہ غالباً یہی ہو سکتی ہے کہ انسان

ارتقاء کے بعد سے تہذیب یافتہ ہوتا گیا ...... اور جب اس نے دیکھا کہ ہاتھی گنے کی شراب پی لینے کے باوجود بھی پلٹ کر اس پر اپنے پیدائشی حقوق جتانے لگتے ہیں تو اس نے انہیں شراب پلانی چھوڑ دی اور توپیں بنانے لگا ...... یہی نہیں بلکہ اخلاقی فرائض نے اسے ایٹمی قوت دریافت کرنے پر مجبور کر دیا۔ ایٹمی قوت جس سے کل کی دنیا اور زیادہ حسین بنائی جا سکے گی۔ ہاں تو کہہ یہ رہا تھا کہ اخلاقی فرائض اور پیدائشی حقوق نہ صرف انسانوں میں پائے جاتے ہیں بلکہ حیوانات بھی ان سے مبرا نہیں ہیں۔ بہت ممکن ہے آئندہ کوئی نباتات میں بھی ان کا وجود ثابت کر دے ...... بہرحال سردست معاملہ حیوانات کا ہے ...... حیوانات میں حقوق و فرائض کی موجودگی کی مثال تلاش کرنے کے لئے آپ کو تھوڑی سی تکلیف گوارہ کرنی پڑے گی ...... دور نہیں صرف افریقہ تک چلنا ہے۔ وہ دیکھئے دریائے نائیجر کے کنارے مگرمچھوں کی قطار نظر آ رہی ہے ...... یہ سب دوپہر کا کھانا کھا کر قیلولہ یا دوسرے الفاظ میں پیدائشی حقوق کا مظاہرہ کر رہے ہیں...... اور چند ننھی منی چڑیاں پھدک پھدک کر ان کے دانتوں میں خلال کرتی پھر رہی ہیں ...... یہ ان کا فرض ہے کہ ہر روز ان اونگھتے ہوئے مگرمچھوں کے منہ کی غلاظت صاف کیا کریں ...... اور ذرا ملاحظہ ہو کہ یہ مگرمچھ کتنے رحمدل واقع ہوئے ہیں۔ ہڑپ نہیں کر جاتے ان چڑیوں کو ...... نہ ہوا ہندوستان ورنہ ان چڑیوں کو اخلاقی فرائض کی ادائیگی کی خاطر خواہ داد مل جاتی ...... نہ جانے کیوں ابھی تک ہندوستانی چڑیوں میں اخلاقی فرائض کا احساس نہیں پیدا ہو سکا ...... حالانکہ یہاں سیکڑوں مگرمچھ اپنے پیدائشی حقوق کا مظاہرہ کیا کرتے ہیں ...... خدا یہاں کی چڑیوں کو عقل سلیم عطا کرے۔ آمین۔

کچھ چڑیوں ہی پر موقوف نہیں یہاں کے سارے حیوانات میں اخلاقی فرائض کی طرف عدم توجہی کی وبا عام ہے۔ کل سے ساون شروع ہوا ہے ...... میری بلی بری طرح چیختی پھر رہی ہے ...... اتنی دردناک آواز میں بلینک ورس پڑھتی ہے کہ سن کر

کلیجہ منہ کو آ جاتا ہے۔ مگر کسی بلے کو توفیق نہیں ہوتی کہ اس کی حزنیہ شاعری کا سلسلہ ختم کر دے ..... کیا وہ یوں ہی چیختی رہے گی ..... کوئی نہ سنے گا اس کی فریاد ..... کاش کوئی بلا اس کی ذہنی کشمکش کا راز پالے ..... کاش کوئی بلا اسے افق کے اس پار لے جائے جہاں محبت کے سوا اور کچھ نہ ہو ..... جہاں اسے چھچھڑوں کے خواب نہ دیکھنے پڑیں..... جہاں اور کیا کہوں ..... اے بلی کاش تو ایک ترقی پسند ادیبہ ہوتی..... کاش تو اپنی جنسی تسکین کے لئے ایک آدھ "چار پائی بولتی رہی" قسم کا نفسیاتی افسانہ لکھ سکتی ..... کاش تو دو چار اسی قسم کے مجموعے چھپوا سکتی۔ ۔ پھر دیکھتی کہ میرا اخلاقی فرض کس طرح تجھے ادبی دنیا میں اچھال دیتا ..... میں تیرے فن پاروں پر تنقیدیں لکھتا..... اتنی زوردار کہ تیری جنسی کشمکش اصلاح کا روپ دھار لیتی ..... میں لکھتا۔

"مشہور ادیبہ کا پہلا مجموعہ "گڑیاں" منصہ شہود پر جلوہ گر ہو کر ہاتھوں ہاتھ بک چکا ہے ..... اب دوسرا ایڈیشن پبلک کے بے حد اصرار پر شائع کیا گیا ہے۔ موصوفہ کا پیدائشی نام دراصل بلی ہے۔ لیکن آپ ادبی دنیا میں الفت شیدائی کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ لکھتی ہیں اور بے پناہ لکھتی ہیں..... آپ نے اپنے نوکیلے پنجوں سے سماج کا پیٹ پھاڑ کر رکھ دیا ہے۔ موجودہ نظام کو اس بری طرح کھرچا ہے کہ وہ ساری زندگی ٹنکچر آئیوڈین کی مالش کراتا رہے گا..... آپ کے افسانوں میں ایک چبھن ہوتی ہے ..... اور یہ ٹیس یہ چبھن افسانوں کے اختتام تک بڑھتے بڑھتے پھوڑا بن جاتی ہے اور پھر یک بیک یہ پھوڑا پھوٹ جاتا ہے۔ بدبودار مواد بہہ چلتا ہے ..... اس مواد میں پہاڑی دریاؤں کی سی روانی ہوتی ہے ..... اور یہ مواد ..... یہ مواد سوسائٹی کے بنائے قوانین کو خیراتی ہسپتالوں میں بہا لے جاتا ہے ..... ڈاکٹر چیخ اٹھتے ہیں..... نرسیں بدحواس ہو جاتی ہیں اور پنسلین کے انجکشن تیار ہونے لگتے ہیں۔

موصوفہ کے پڑھنے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ آپ کے حالات زندگی

سے بھی تھوڑی بہت واقفیت رکھیں ورنہ ان افسانوں کا سمجھنا دشوار ہو جائے گا ..... موصوفہ ایک اعلیٰ خاندان کی بلی ہیں۔ آپ کا بلا فلمی دنیا میں واحد حنیف کے نام سے مشہور ہے اور شراب پی کر فلمی ایکٹسراؤں کے ساتھ گلچھرے اڑاتا پھرتا ہے ..... اب شروع کیجئے ان افسانوں کو ..... دیکھئے ہر افسانے کے پس منظر میں واحد حنیف کی بے راہ روی اٹکھیلیاں کرتی پھر رہی ہے ..... اور الفت شیدائی کی آواز کتنی دردناک ہے۔ کاش ان کا بلا راہ راست پر آ سکتا..... کاش سماج کے سارے بلے کچھ سوچ سکتے ..... اس دکھ بھری آواز کا راز پا سکتے ..... کاش کوئی بلا واحد حنیف کا پیٹ پھاڑ سکتا..... کوئی نہیں ..... کوئی بھی نہیں ..... اس وسیع دنیا میں کوئی ایسا نہیں جو ان الجھنوں کا خاتمہ کر کے سوسائٹی کے بہت سے افراد کو لنگڑا کر چلنے سے بچا لے .....۔

الفت شیدائی کے افسانوں میں Twist کی بہتات اس قابل ہے کہ اسے سنہری حرفوں میں لکھا جائے ..... آپ کی Twist ہی آپ کو دوسری لکھنے والیوں میں ممتاز کرتی ہے۔ آپ کے افسانوں میں Surprise کا عنصر دیکھ کر تو یہ معلوم ہوتا ہے جیسے آسکر وائلڈ نے بلی کے روپ میں جنم لے لیا ہو۔

رجعت پسند آپ پر فحش نگاری کا الزام لگاتے ہیں جو کسی طرح جائز نہیں۔ ان گوبر بھری کھوپڑیوں میں اتنا بھی سلیقہ نہیں کہ آرٹ کو سمجھ سکیں..... میں تو یہ کہوں گا یہ سب کچھ سمجھتے ہیں۔ مگر ہٹ دھرمی سلامت رہے ..... اجنتا کی تصاویر دیکھ کر بے اختیار "آرٹ آرٹ" کا نعرہ لگا کر الفت شیدائی کے افسانے پڑھنے کے بعد ناک بھوں سکوڑنے والے ہٹ دھرم نہیں تو اور کیا کہے جا سکتے ہیں..... یہ خود بھی گمراہ ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں ..... عوام کو میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ اس قسم کے چار سو بیس کرنے والوں سے ہوشیار رہیں ..... یہ ہمیں پانچ سو برس پہلے کی دنیا میں لے جانا چاہتے ہیں جہاں لوگ کپڑے پہنا کرتے تھے ..... ہندوستان جیسے گرم ملک میں

کپڑے قطعاً غیر ضروری ہیں...... یہاں کپڑے پہننا مادر وطن کی کھلی ہوئی توہین ہے ...... جسے ہم ترقی پسند برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں......۔

الفت شیدائی کے افسانے تکلفات اور اخلاقیات کے ڈھونگ سے بالکل پاک ہیں جو وہ کہنا چاہتی ہیں صاف صاف کہتی ہیں...... وہ بھی اس لئے کہ سوسائٹی کے ناکارہ افراد خود میں عملی قوتوں کی فراوانی محسوس کر سکیں ...... وہ قوم کے سوئے ہوئے نوجوانوں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگاتی ہیں...... آواز دے کر جگانا ان کی شریعت میں رسمی حیثیت رکھتا ہے ...... وہ مخلصانہ انداز میں اس بری طرح جھنجھوڑتی ہیں کہ ہمارے نوجوان رسائل میں افسانے یا نظمیں پڑھنے کی بجائے سب سے پہلے دواؤں کے اشتہار دیکھتے ہیں...... یہی ہے وہ ادب برائے حیات جس پر آنے والی نسلیں بجا طور پر فخر کر سکیں گی...... آیئے ہم سب مل کر الفت شیدائی کی سالگرہ منائیں...... اور دعا کریں کہ آپ کی سالگرہیں رہتی دنیا تک منائی جاتی رہیں۔

للہ اب خاموش ہو جا...... میری بلی آخر میں تیرے لئے اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا ہوں ...... ایسی پر مغز تنقید شاید میں اپنے افسانوں پر بھی نہ لکھ سکوں گا۔ خدارا اب چپ بھی رہ ...... تیری یہ دکھ بھری آواز میرے دل کی گہرائیوں میں اترتی جا رہی ہے......اے ساون کے مہینے ...... للہ میری بلی پر رحم کر...... آخر میں اس کے لئے کیا کروں ...... کاش میرا اخلاقی فرض اس کے لئے ایک عدد بلا تلاش کر سکتا...... دیکھ اے بلی اب اپنی بکواس بند کر ...... بہت ہو چکا...... کسی اپنی ہم جنس کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی کوشش کر...... مجھے انسانوں ہی سے فرصت نہیں...... تیرے لئے کیا کر سکوں گا ...... مجھے اپنے ہم جنسوں کے پیدائشی حقوق سے الجھنے دے ...... میرے اخلاقی فرائض کم از کم تیرے لئے بالکل بیکار ہیں...... انسان تو میری سنتے نہیں بلے کیا سنیں گے......

کل سے چیخ رہا ہوں مگر بلی ہے کہ سنتی ہی نہیں...... اخلاقی فرائض کی طلب گار ہے مگر یہ نہیں جانتی کہ ہندوستانی جانوروں میں ابھی صرف پیدائشی حقوق کا شعور پیدا ہوا ہے۔ اخلاقی فرائض کے احساس کی پیدائش میں ابھی سینکڑوں برس لگیں گے۔ اگر اتنے عرصہ تک صبر نہیں کر سکتی تو افریقہ چلی جا جہاں ننھی منی چڑیاں مگرمچھوں کے منہ کی غلاظت صاف کیا کرتی ہیں۔

آخر میں اتنا اور کہنا ہے کہ آپ صرف پیدائشی حقوق ہی کے اجارہ دار نہیں بلکہ آپ کے ساتھ بھی کچھ اخلاقی فرائض ہیں۔ آپ کا سب سے پہلا اخلاقی فرض یہ ہے کہ اس مضمون کو پڑھنے کے بعد رسالہ سے الگ کر کے اسے چولھے میں جھونک دیں...... کیونکہ نہ تو یہ "ادب برائے ادب" کا حامل ہے اور نہ "ادب برائے حیات" کا بلکہ یہ ہے ...... ذرا کان ادھر لایئے ...... لاحول ولاقوۃ آپ تو گھبرا گئے ...... دیکھتے نہیں میرے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں...... کچھ آہستہ سے کہنا ہے...... ٹھیک...... تو سنئے...... یہ ہے، "ادب برائے آتشدان"

قواعد اردو

بچو کبھی تم نے یہ سوچا کہ تم گھر میں پٹتے کیوں ہو؟ تمہارے بزرگ تمہارے مشوروں پر عمل کیوں نہیں کرتے؟ تم آئے دن بیمار کیوں رہتے ہو؟ اکثر تمہارا معدہ کیوں خراب رہتا ہے؟

تم اگر سوچو تو یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ لہٰذا میں تمہیں بتاؤں گا۔ سنو ان سب کی ایک ہی وجہ ہے، وہ یہ کہ تم قواعد اردو سے ناواقف ہو۔ پس قواعد اردو وہ علم ہے جس کے نہ جاننے سے آدمی لولا، لنگڑا، گونگا، بہرا، اندھا۔ غرضیکہ بالکل اپاہج ہو جاتا ہے۔

اگر ہم قواعد اردو کو بیچ سے پھاڑ دیں تو اس کے دو حصے ہو جائیں گے۔ تب ہم ایک حصے کو علم صرف کہیں گے اور دوسرے کو علم نحو۔

ابھی ہم تمہیں صرف علم صرف کے متعلق کچھ بتائیں گے۔ علم صرف میں سب سے پہلی چیز لفظ ہے۔ لفظ کے معنی لغت میں منہ سے کسی چیز کے پھینکنے کے ہیں۔ مثلاً تھوک، بلغم اور قے وغیرہ اگر کوئی تمہارے منہ پر گھونسہ مارے اور تمہارا ایک دانت ٹوٹ کر گر پڑے تو اسے بھی لفظ ہی کہیں گے۔ دانت ٹوٹنے کے ساتھ ہی اگر خون نکل پڑے اور درد بھی ہونے لگے تو خون اور درد کو معنی کہیں گے...... کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دانت خود بخود ٹوٹ کر گر جاتے ہیں نہ خون نکلتا ہے اور نہ درد ہی ہوتا ہے۔ ایسے دانتوں کو مہمل کہتے ہیں۔ جیسے بوڑھوں کے دانت۔

تعریف:۔ پس ثابت ہوا کہ وہ الفاظ جو معنی نہیں رکھتے مہمل کہلاتے ہیں اور معنی دار الفاظ کو کلمہ بھی کہتے ہیں۔

فائدہ:۔ اگر منہ میں ایک بھی لفظ نہ ہو تو حلوہ یا دودھ نصیب ہوتا ہے۔

تنبیہہ:۔ دانتوں کی حفاظت کرنا ہر ایک کا فرض ہے ورنہ وہ مہمل ہونے سے پہلے ہی لفظ بن جاتے ہیں۔ اس لئے ہمیشہ کالی نوس منجن اور مسواک برش استعمال کرو۔

جملہ

تم نے اکثر دیکھا ہوگا کہ جو بچے تم سے لڑائی میں جیت نہیں پاتے وہ تمہارے دانت کاٹ لیتے یں۔ اس طرح وہ اپنے بتیسیوں دانت استعمال کرتے ہیں۔ ایک دانت تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ مگر جب بتیسیوں دانت استعمال کئے جاتے ہیں تو تم بلبلا اٹھتے ہو پس ثابت ہوا کہ الفاظ کا ایسا مجموعہ جس سے پوری پوری بات سمجھ میں آ جائے جملہ کہلاتا ہے۔

کلمہ کی قسمیں

تم یہ پڑھ چکے ہو وہ لفظ جو معنی رکھتا ہے کلمہ کہلاتا ہے۔ اب ہم تمہیں کلمے کی پہلی پشت سے روشناس کراتے ہیں۔

شجرہ کلمہ

کلمہ

اسم   ضمیر   فعل   صفت   حرف

اسم اور اس کی قسمیں :۔ اسم وہ کلمہ ہے جس کے بغیر زندگی تلخ ہو جائے ۔ اس کی دو قسمیں ہیں، اسم معرفہ اور اسم نکرہ ۔

اگر تم کسی سے اس کا اسم شریف دریافت کرو اور وہ جواب دیدے تو ہم اسے اسم معرفہ کہیں گے جیسے رام کھلاون، محمد فاضل اور ایڈورڈ ہشتم وغیرہ۔

اگر تم کسی سے اس کا اسم شریف دریافت کرو اور وہ جواب نہ دے پائے تو وہ اسم نکرہ کہلائے گا۔ جیسے بکرا، کتا، چمگادڑ، چھپر کھٹ، جرکٹ اور مونگ پھلی وغیرہ۔

فائدہ :۔ اکثر اسم شریف دریافت کرنے پر لوگ رشتہ دار نکل آتے ہیں۔

تنبیہہ :۔ خبردار کبھی کسی ایسے کتے سے اسم شریف نہ پوچھنا جس سے تمہاری اچھی طرح جان پہچان نہ ہو ورنہ تمہیں معلوم کر کے بہت مایوسی ہوگی کہ جسے تم اسم نکرہ سمجھ رہے تھے وہ جملہ نکلا۔

اسم کی قسمیں گنتی کے لحاظ سے :۔ گنتی کے لحاظ سے اسم کی دو قسمیں ہیں۔
(۱) واحد (۲) جمع۔

واحد :۔ وہ اسم ہے جو کسی تنہا چیز کے لئے بولا جائے، الو، ٹماٹر، اونٹ، اود بلاؤ وغیرہ

جمع :۔ وہ اسم ہے جو ایک سے زیادہ چیزوں کے لئے بولا جائے جیسے کئی الو، کئی ٹماٹر، کئی اونٹ کئی اود بلاؤ۔

تنبیہہ :۔ یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ دنیا میں بہتری ایسی چیزیں بھی ہیں جو بیک وقت واحد اور جمع دونوں ہوتی ہیں۔ جیسے پائجامہ جو نیچے سے جمع اور اوپر سے واحد ہوتا ہے۔

اسم کی قسمیں بلحاظ جنس :۔ اللہ پاک بڑا مسبب الاسباب ہے اس نے ہر نر کے لئے مادہ اور ہر مادہ کے لئے نر پیدا کیا ہے۔ جنس کے لحاظ سے اسم کی دو قسمیں ہی تیں۔ (۱) مذکر (۲) مونث

مذکر :۔ ایسے اسموں کو مذکر کہتے ہیں جو نر کے لئے بولے جائیں جیسے حرامزادہ، الو کا پٹھا اور سور کا بچہ۔

مونث :۔ ایسے اسموں کو مونث کہتے ہیں جو مادہ کے لئے بولے جائیں جیسے حرامزادی، الو کی پٹھی اور سور کی بچی۔

ضمیر اور اس کی قسمیں :۔ ضمیر بہت فائدہ مند چیز ہے اگر تم خوف کے وجہ سے کسی کا اسم شریف نہ بتا سکو تو اس کی جگہ بے دھڑک ضمیر استعمال کر سکتے ہو مثلاً والد صاحب کی جگہ "وہ" اور ڈنڈے کی جگہ "یہ"

اس کی تین قسمیں ہیں۔ متکلم، حاضر، غائب

متکلم ہیڈ ماسٹر صاحب کی بیت کو کہتے ہیں اور حاضر غائب سمجھنے کے لئے روزانہ اپنے کلاس کے رجسٹر کا مطالعہ کیا کرو۔

فعل اور اس کی قسمیں :۔ فعل وہ کلمہ ہے جس کی جگہ مشینیں لے لیتیں تو زیادہ اچھا تھا۔

بلحاظ معنی فعل کی دو قسمیں ہیں :۔ فعل لازم اور فعل متعدی

اگر تم کسی گدھے کو چھیڑو تو اسے لازم ہے کہ تمہارے ایک عدد لات رسید کر دے۔ پس لات مارنے کے فعل کو فعل لازم کہتے ہیں۔ کلاس میں اگر تم سے فعل لازم کی تعریف پوچھی جائے تو فوراً ایک گدھا تلاش کرو۔ اگر گدھا نہ ملے تو تم خود ہی ماسٹر صاحب کو فعل لازم اچھی طرح سمجھا دو۔ اگر امتحان میں ایسا کرو گے تو ہمیشہ اول آؤ گے۔

فعل متعدی کو مرض متعدی بھی کہتے ہیں۔ جیسے تپ دق ہو جانا، ہیضہ ہونا، طاعون آنا، گردن توڑ بخار آنا وغیرہ وغیرہ۔

زمانہ :۔ فعلوں میں زمانے بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ تین قسم کے ہوتے ہیں۔
(۱) ماضی (۲) حال (۳) مستقبل۔

"حال :۔ قوالی سنتے سنتے بعض بزرگ اچھلنے کودنے لگتے ہیں یہی حال کہلاتا

ہے۔ اکثر بڑے کمرے کو بھی کہتے ہیں۔ مگر ایسی صورت میں جب اس میں ہائے حطی کی بجائے ہائے ہوز ہو۔

مستقبل:۔ ہر وہ چیز جو قطعی لغو ہو مستقبل کہلاتی ہے۔ بلکہ بعض علماء کی رائے تو یہ ہے کہ مستقبل کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ اس لئے جو چیز تمہاری سمجھ میں نہ آئے اسے مستقبل ہی سمجھو۔

ماضی:۔ یہ ایک قسم کا نشہ ہے۔ مختلف قسم کی منشیات کی آمیزش سے کئی قسم کے ماضی بنتے ہیں۔

(۱) ماضی قریب:۔ ہلکا سا نشہ جو کسی سخت قسم کے تمباکو سے آجائے۔

(۲) ماضی بعید:۔ شراب میں افیون گھول کر پینے سے جو نشہ آجائے۔

(۳) ماضی شکیہ :۔ وہ شخص جو خود تو شراب پیتا ہو لیکن اپنی بیوی کے چال چلن پر شک ہونے کی بناء پر اسے قتل کر کے کہیں فرار ہو جائے ایسے فعل کو ہم ماضی شکیہ کہیں گے۔

ماضی استمراری: یہ کم از کم پندرہ قسم کی منشیات کی آمیزش سے تیار ہوتا ہے۔ بعض اوقات اسے استمراری بندوبست بھی کہتے ہیں۔

ماضی تمنائی:۔ شراب کی تمنا دل میں لئے ہوئے دنیا سے رخصت ہو جانا۔

ماضی شرطی:۔ شرط بد کر شراب پینا۔

تنبیہہ :۔ خبردار کلاس میں ماضی و حال کی مشق ہرگز نہ کرنا ورنہ نتیجے کے تم خود ذمہ دار ہوگے۔

مضارع:۔ یہ ایسا فعل ہے کہ اس سے حال اور مستقبل دونوں سمجھے جاتے ہیں۔ یعنی ایسی اچھل کود جو قطعی سمجھ میں نہ آئے۔

تنبیہہ :۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ تم کسی لیڈر کو تقریر کرتے دیکھ کر اس کے فعل کو مضارع سمجھ لو ممکن ہے کہ جس زبان میں وہ تقریر کر رہا ہو وہ تمہاری سمجھ سے بالاتر ہو......

فعل امر:۔ یہ ایسا فعل ہے جسے تم ہرگز پسند نہ کرو گے اس لئے اس کی تعریف نہ کی جائے گی۔

فعل نہی:۔ چھٹی ہونے سے قبل ہی اسکول سے کھسک لینے کو فعل نہی کہتے ہیں۔

تنبیہہ : فعل نہی کی مشق روزانہ کرو، ورنہ تمہارے پاس ہونے کی ذمہ داری نہ لی جائے گی۔ اس بات کا ہمیشہ خیال رکھو کہ فعل کے ساتھ فاعل کا ہونا اشد ضروری ہے۔ اگر کسی وجہ سے تم فاعل نہ مہیا کر سکو تو اسی وقت بری الذمہ ہو سکتے ہو۔ جب فاعل کا میڈیکل سرٹیفکیٹ داخل کر دو اور ہاں دیکھو بعض اوقات فعل اور فاعل کے ساتھ ایک عدد مفعول بھی درکار ہوتا ہے۔ ایسے مواقع پر گھبرانا نہ چاہئے ...... ایسی صورت میں ہمیشہ فاعل کو رشوت دے کر منالو...... خدا نے چاہا تو وہ خود ہی اپنے مفعول ہونے کا بھی اعلان کر دے گا...... اس لئے کہ رشوت بڑے بڑے دیش سیوکوں تک کو سیدھا کر دیتی ہے۔

صفت

(۱) کلوٹی لڑکی

(۲) ولائتی الو

(۳) پانچویں بندریا

اوپر کی مثالوں میں لڑکی، الو اور بندریا کے متعلق کچھ کہا گیا ہے۔ جو کچھ کہا گیا ہے۔ وہی ان تینوں کی صفت ہے۔ جس کی صفت بیان کی جاتی ہے اسے موصوف کہتے ہیں اس طرح لڑکی، الو اور بندریا موصوف ہوئے اور کلوٹی، ولائتی اور پانچویں صفت۔ پس ثابت ہوا کہ وہ کلمہ جو کسی کی چغلی کھائے اسے صفت کہتے ہیں اور جس کی چغلی کھائی جائے اسے موصوف کہتے ہیں۔

تنبیہہ :۔ ہمیشہ یاد رکھو کہ اللہ پاک چغلخور کو کبھی معاف نہیں کرتا۔ لہٰذا جب کبھی کلاس میں صفت پڑھائی جانے لگے تو فوراً واک آؤٹ کر جاؤ۔ اگر اس پر بھی ٹیچر باز نہ آئے تو اسکول میں اسٹرائک کرا دو۔

صفت کی تین قسمیں ہیں۔ (۱) صفت مشبہ (۲) صفت نسبتی (۳) صفت عددی۔ وہ صفت جو ہمیشہ اپنے موصوف کی چغلی کھاتی رہے صفت کہلاتی ہے۔

وہ صفت جو صرف نسبت ہی نہیں بلکہ شادی بھی کرا دے صفت نسبتی کہلاتی ہے۔

صفت عددی وہ نامعقول صفت ہے جس میں اعداد اور ہندسے پائے جاتے ہیں۔ تم اس کے متعلق کچھ معلوم کرنا ہرگز پسند نہ کرو گے۔

حرف

حرف وہ کلمہ ہے جو اردو کی ابتدائی کتابوں میں بکثرت پایا جاتا ہے۔

حرف کی قسمیں:۔ حرف جار۔۔۔اس کو مرتبان بھی کہتے ہیں۔ یہ اچار، چٹنی اور مربے وغیرہ رکھنے کے کام میں آتا ہے۔

حرف ندا:۔ اس کو کوہ ندا بھی کہتے ہیں۔ اس کا پتہ طائی کے بیٹے حاتم نے لگایا تھا۔

حرف ندبہ:۔ وہ کلمہ ہے جسے حاملہ عورتیں بکثرت استعمال کرتی ہیں۔ جیسے مٹی، لیموں، اچور وغیرہ۔ اس کلمے کو استعمال کرنے والے کو مندوب کہتے ہیں۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ مندوب نہیں مجذوب کہتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حرف عطف:۔ وہ کلمہ ہے جسے کسی کا سایہ عاطفت نہ نصیب ہو۔

حرف استثناء:۔ بات کرتے وقت چھینک یا کھانسی آجائے تو اسے حرف

استثناء کہیں گے۔

حرف علت:۔ یہ دراصل حرف علالت تھا کثرت استعمال کی وجہ سے حرف علت رہ گیا۔ مراد اس سے وہ کلمہ ہے جو مرنے کے بعد بیماروں کو کھلایا جاتا ہے تاکہ قبر میں بھی کوئی بیماری نہ ہونے پائے۔

حرف شرط اور جزا:۔ وہ کلمہ جو شرط بد کر دوڑنے پر گر پڑنے کے بعد منہ سے نکلے حرف جزا کہلاتا ہے۔ اگر گر پڑنے والے کے والدین آپس میں شرط بد کر اسے دوبارہ دوڑا دیں ہم اسے حرف شرط کہیں گے۔

بچو علم صرف کا بیان ختم ہو گیا۔ اب تمہیں تحلیل صرفی کرنا سکھایا جائے گا۔ تحلیل صرفی کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے ایک جملہ لکھ لو پھر اس کے ٹکڑے کرو۔ اگر ٹکڑے برابر کے نہ ہوں تو کسی بڑھئی سے مدد لو۔ اگر جملہ ملائم ہو تو ٹکڑے کرنے سے بہتر یہ ہو گا کہ اس کا قیمہ کر لو۔ ایسے قیمے کو تحلیل صرفی کہیں گے۔

قواعد اردو کا پہلا حصہ ختم ہوا۔ دوسرے حصے میں تم علم نحو کا بیان پڑھو گے ..... اسے پڑھ کر تم اپنے جسم میں ایک خاص قسم کی توانائی محسوس کرو گے ..... تم نے حکیم اجمل خاں مرحوم کا نام ضرور سنا ہو گا۔ ان کے دواخانہ کی ساری دوائیں ترکیب نحوی ہی سے تیار کی جاتی تھیں۔ اسٹی فن نے جو انجن تیار کیا تھا۔ اس میں بھی ترکیب نحوی لگائی تھی۔ مشہور سائنس دان فرنکلن توسٹ پر مکھن کے بجائے ترکیب نحوی لگا کر کھاتا تھا۔ اسی لئے وہ آسمان پر چمکنے والی بجلی کو گرفتار کر کے تمہاری تاریک گلیوں کو چمکانے میں کامیاب ہوا۔ زیادہ تعریف خلاف قانون ہے۔ اگر اس کے آگے معلوم کرنا چاہتے ہو تو میری لکھی ہوئی کتاب قواعد اردو کا دوسرا حصہ نکال کر پڑھو..... تمام پرائیویٹ حالات کھول کھول کر لکھ دیئے گئے ہیں۔

اختلاج نامہ

اس وقت ہمارے سامنے "نیا خفقان" کا "اختلاج نمبر" ہے۔ جو ابھی حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ یہ واحد کثیر الاشاعت رسالہ ہے۔ جو پندرہ ہزار برس سے علم و ادب، طب قدیم و جدید اور فنون لطیفہ کی خدمت کر رہا ہے۔ اگر اسے بین الاقوامی رسالہ کہا جائے تو بے جانہ ہو گا، کیونکہ یہ بلیا سے لے کر ٹمبکٹونک اور شکارپور سے لے کر ہنالولو تک پایا جاتا ہے۔ اس رسالہ کی سب سے بڑی اور غیر معمولی خوبی یہ ہے کہ اس کا ہر شمارہ کوئی نہ کوئی "نمبر" ہوتا ہے۔ غالباً قارئین کرام اس کا پچھلا شمارہ "چھینک نمبر" ابھی تک نہ بھولے ہوں گے۔

"اختلاج نمبر" صوری و معنوی دونوں حیثیتوں سے "شاہکار" قرار دیئے جانے کے قابل ہے۔ اس کے ایڈیٹوریل میں "ادب اور اختلاج" پر بحث کی گئی ہے۔ فاضل ایڈیٹر نے منطقی دلائل سے کام لے کر اس چیز کو "اجاگر" کرنے کی کوشش کی ہے کہ ادب محض اختلاج کی وجہ سے دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے ..... اگر ادب سے "اختلاجیت کا عنصر" علیحدہ کر دیا جائے تو ادب صفر ہو کر رہ جائے گا ..... ایڈیٹوریل کے بعد ہی حضرت اصفہانی دواخانہ دہلوی کی نظم "آدھی رات" اور "معجون طلسم حیات" ہے۔ نظم بتدریج نقطہ عروج کی طرف بڑھتے بڑھتے "محصول ڈاک بذمہ خریدار پر ختم ہو گئی ہے۔ نظم کو پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے "لحاف" میں سے "دھواں" اٹھ رہا ہو ..... جیسے ساری قوم "پھسلن" میں رپٹ

کر ماء الحم کی بوتل میں جا پڑی ہو ..... ہپ ..... ہپ ہرا۔

حضرت گرو دیو قلا نے ڈکھانے کا افسانہ "اشتہاری بلاؤں سے بچو" تو اس قابل ہے کہ اسے ہر شریف خاندان کے افراد زبانی یاد کر لیں۔ یوں تو پورا افسانہ بہت عمدہ ہے مگر ایک حصہ جہاں ہیروئن ہیرو سے کہتی ہے "اصلی نسخہ شائع ہو گیا" اپنی مثال نہیں رکھتا۔

دیکھئے کتنا دلچسپ ہے یہ حصہ :-

ہیروئن گنڈیریاں چوستی ہوئی ہیرو سے کہتی ہے "اصلی نسخہ شائع ہو گیا ..... کہیں نوٹ کر لو ..... شیر کی چربی، کالے سانپ کی چربی، ریچھ کی چربی، خرگوش کی چربی ہم وزن لے کر ہاتھی کے دودھ میں ساڑھے سات دن تک کھرل کرو ..... اس کے بعد بذریعہ پاتال جنتر اور پھر اس کے بعد بذریعہ ڈول جنتر تیار کر کے نیلے رنگ کی شیشی میں رکھ لو ..... اگر خود نہ بنا سکو تو مجھ سے خرید لو ..... کیا سمجھے ..... اگر فائدہ نہ کرے تو ایمان دھرم سے لکھ دینے پر آدھی قیمت واپس ہو جائے گی۔

حضرت نہ حکیم نہ ڈاکٹر گورداسپوری کی مسلسل غزل "بہتوں کا خدا اس کے پڑھنے سے خوش ہو گا۔" اس صدی کی بہترین غزل ہے۔ یہ غزل رنگ قدیم کی علمبردار ہے۔ قوافی کا التزام حد درجہ حسین ہے۔ غزل کا مقطع ہے "رفاہ عام کے لئے خریداروں سے صرف لاگت وصول کی جاتی ہے" ___ اس مقطع میں زندگی کی انوکھی دھڑکنیں انگڑائیاں لے رہی ہیں۔ اسے پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ایک چوڑے منہ کی بوتل سے بچوں کی ایک فوج بر آمد ہو کر چیخ رہی ہو "ایک بچے کی قیمت صرف ساڑھے تین روپیہ اور محصول ڈاک معاف"۔

مشہور فرانسیسی ڈراماٹسٹ موسیو میڈیکل اسٹور کے ڈرامے کا ترجمہ "سفید خطرہ" اردو پڑھنے والوں کے لئے بالکل نئی چیز ہے ..... ہم "اختلاج نمبر" کے ممنون ہیں کہ وہ اپنے دامن میں ایسا گوہر آبدار لے کر آیا ہے جو قوم کے جوہر کو اور زیادہ چمکا دے گا ..... ڈرامہ نہایت شاندار ہے۔ مصنف نے قلم توڑ کر رکھ دیا ہے اور بیٹھا

سوچ رہا ہے کہ اب کس چیز سے لکھے۔ اچانک اپنے لڑکے پر بگڑتا ہے "تمہاری آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں اڑتی ہیں۔ تمہارا سر چکراتا رہتا ہے ...... تم دوستوں سے ملتے ہوئے کتراتے ہو...... تم بڑے نالائق ہو جی! تمہاری رنگت پیلی پڑتی جارہی ہے ...... تمہارے چہرے پر بڑے نکلے آرہے ہیں ...... تم ایک خاص موقع پر ضرور بالضرور خودکشی کرنے کے لئے سوچو گے کہ کود جاؤ ساتویں منزل سے تم ...... مگر تمہیں یاد رہے کہ میں تمہیں مرنے نہ دوں گا ...... میں ساتویں منزل کے نیچے جال لگوا دوں گا ...... اگر خیریت چاہتے ہو تو آج ہی ساڑھے پانچ روپے کا وی، پی منگوالو" ......

اتنا کہہ کر اپنی لڑکی کی طرف قہر بھری نگاہوں سے گھورتا ہے اور چیخنے لگتا ہے "تم ...... تم ...... تم منچوریا کی مریض ہو ــــ تم چودھویں سال میں چالیس سال کی بوڑھیا معلوم ہوتی ہو ...... تم تم دور ہو جاؤ میری آنکھوں کے سامنے سے ورنہ شوٹ کر دوں گا ......"

ایک صاحبہ (جو غالباً لیڈی ڈاکٹر تخلص کرتی ہیں) کا افسانہ "محافظ اجداد" اس قابل ہے کہ اسے ان کی زندگی ہی میں "شاہکار" تسلیم کر لیا جائے۔ اس افسانے کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ملک کے ہر رسالے میں قریب قریب ہر ماہ شائع ہوتا ہے۔ اس افسانے میں ایک پیغام ہے ...... ایک چیخ ہے جو قاری کے ایک کان میں گھس کر دوسرے سے صاف نکل جاتی ہے ...... ہم محترمہ کی اس قومی خدمت کے صلے میں ان کی خدمت میں صرف مبارکباد پیش کرتے ہیں اور اس کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ شاید ان کا یہ مشن کامیاب نہ ہو سکے۔ کیونکہ ان کے دوسرے بھائی بند آئے دن طرح طرح کی پرلطف "گولیاں" تصنیف کر کے ان کی راہ میں روڑا ثابت ہو رہے ہیں ...... بہرحال ہم تو یہی چاہتے ہیں کہ "عوام" کے ساتھ ساتھ بیکاری اور افسانہ نگاری بھی بڑھے ...... حضرت نجانے کون بھنڈار امرتسری کا تحقیقی مقالہ "ہمالیہ کی وادیوں میں" اپنی مثال آپ ہے۔ اس مضمون میں پہاڑی جڑی بوٹیوں کے کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ساتھ ہی ساتھ محسن قوم حضرت لنگور کی کامیاب رہنمائی پر بھی بحث کی گئی

ہے۔ فاضل مضمون نگار بڑی چابک دستی کے ساتھ مضمون کو ہنکاتے ہوئے محسن قوم حضرت لنگور کی خدمات کا اعتراف کرتا ہے۔ اگر صاحب مضمون نے اجازت دی تو ہم اسے نظم کے قالب میں ڈھال کر پرائمری اسکولوں کے لئے بحیثیت قومی گیت منظور کرانے کی کوشش کریں گے۔

حضرت سفیدہ کاشغری کی تنقید "شاعر اور سلاجیت" اردو تنقید میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے۔ نہ صرف تنقید بلکہ غالب کی شاعری کا نفسیاتی تجزیہ بھی ہے۔ تنقید کا ایک حصہ بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے:۔

"غالب کا مطالعہ کرتے وقت یہ بات کبھی نہ بھولنی چاہئے کہ سلاجیت مرزا کے لاشعور میں ایک اچھے عہدہ پر فائز ہو گئی تھی۔ اسی لئے ان کے اشعار میں ایک عجیب قسم کا زور پایا جاتا ہے۔ مثلاً ع

اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

بعض متقدمین کے یہاں بھی "سلاجیتیت" پائی جاتی ہے۔ مگر ان کے یہاں وہ زور جس کی بناء پر مرزا غالب سب سے الگ تھلگ نظر آتے ہیں نہیں پایا جاتا۔ اس کی وجہ یہ بتلائی جاتی ہے کہ مرزا غالب "اصلی سلاجیت" استعمال کرتے تھے۔ لہٰذا اسی بناء پر ان کا زور کلام متقدمین اور متاخرین سبھوں کو پیچھے چھوڑ گیا۔ آج کل کے شعرا کو حالانکہ سلاجیت نصیب نہیں ہوتی پھر بھی ان کے لاشعور پر سلاجیت کا گہرا اثر معلوم ہوتا ہے۔ اگر آج کے شعراء کرام اپنے کلام کو اور زیادہ زور دار بنانا چاہتے ہوں تو "اصلی سلاجیت" استعمال کریں جو کوہستانی دواخانہ دہلی سے اب بھی خریدی جا سکتی ہے اور پانچ تولہ اکٹھی منگوانے پر محصول ڈاک بھی معاف ہو سکتا ہے۔"

فاضل نقاد نے بڑی کدو کاوش کے ساتھ تنقید لکھی ہے "غالب کے کلام میں سلاجیت کا عنصر یقیناً ایک نئی اور قابل قدر دریافت ہے لیکن نئے شعراء کے یہاں اس کی اثراندازی کے متعلق حسن ظن سے کام لیا گیا ہے۔ آج کی شاعری عوام میں جنم لیتی ہے اور بیچارے عوام سلاجیت سے اتنے ہی دور ہیں جتنے کہ مرزا غالب عوام سے۔

آج کے شاعر کے یہاں زور بیان محض "طبقاتی کشمکش" کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کے لاشعور پر سلاجیت کے بجائے وہ عورتیں چھائی ہوئی ہیں جو سڑکوں پر چیختی پھرتی ہیں ـــ "کمر کی دوا لو ـــ بائی کی دوا لو ـــ شال مشری کی دوا لو ـــ شفید موشلی کی دوا لو ـــ دوا لو کجوری کی دوا لو ـــ" ظاہر ہے جس قوم کی عورتیں "کجوری کی دوا بیچتی ہوں اس قوم کے شاعروں کے زور کا کیا حال ہو گا۔ نقاد صاحب زور بیان کے لئے اصلی سلاجیت کے استعمال کا مشورہ نہ دیں تو بہتر ہے۔ ورنہ بہت جلد سرمایہ داری کا خاتمہ ہو جائے گا......

جارج برنارڈ شا کے چھوٹے بھائی حضرت بروک بانڈ کا مضمون "اجنتا کی نقاشی" بھی بہت خوب ہے۔ آپ کو سن کر تعجب ہو گا کہ بروک بانڈ صاحب ہندوستان کی ہر زبان کے ایک سحر طراز ادیب ہیں۔ آپ کی سحر طرازی کا یہ عالم ہے کہ آپ ہر ہندوستانی کی رگ رگ میں سما کر رہ گئے ہیں۔ آپ کا مضمون "اجنتا کی نقاشی" افتتاح نمبر کے لئے باعث صد افتخار ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ مضمون دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا ـــ ممکن ہے کہ آپ کی نظروں سے لپٹن صاحب کا مقالہ "گویوں کے تاجدار تان سین" بھی گزرا ہو...... کیا خیال ہے آپ کا...... "اجنتا کی نقاشی" اور "گویوں کا تاجدار تان سین" کا مرکزی خیال ایک ہی ہے یا نہیں...... ہمیں نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ بہت بری بات ہے۔ بروک بانڈ صاحب اور لپٹن صاحب دونوں ہی چوٹی کے ادیب ہیں۔ کم از کم انہیں اس قسم کی اوچھی باتوں سے پرہیز کرنا چاہئے۔

حضرت ف. ب خالد کا افسانہ "میری دکھ بھری داستان" ایک کامیاب افسانہ ہے۔ مصنف نے اس میں بتایا ہے کہ کس طرح اس کے بےاولاد والدین کو ایک فقیر ملا اور اس نے انہیں ان کے دکھ کا علاج بتا کر بچے کی پیدائش پر اس کا نام فقیر بخش رکھنے کی تاکید کی...... کس طرح افسانہ نگار کی محبوبہ اس سے اس کے نام کی بناء پر نفرت کرنے لگی...... کس طرح وہ دکھ سہتے سہتے عاشق سے شاعر ہو گیا...... کس طرح

اسے اپنے نام سے نفرت ہو گئی اور اس نے خود کو فقیر بخش خالد کے بجائے ف. ب. خالد لکھنا شروع کر دیا۔ آخر میں افسانہ نگار نے عوام کو مخاطب کر کے کہا ہے کہ اس کے پاس فقیر کی بخشی ہوئی جڑی بوٹیاں اب بھی موجود ہیں۔ جن بے اولاد بھائیوں کو ضرورت ہو اس سے طلب کریں ـــ منافع لینا اس کے لئے حرام ہے۔ صرف دوا کی لاگت لیتا ہے...... وہ بھی عوام کی بھلائی کے کاموں پر صرف کر دی جاتی ہے۔

حضرت رفیق دواخانہ الہ آبادی کی آزاد نظم "شباب انقلاب" بھی خوب ہے۔ اس نظم کا مرکزی خیال بہت ہی انقلابی ہے۔ مرکزی خیال یہ ہے کہ کس طرح شباب میں انقلاب آجاتا ہے۔ انقلاب کے لئے شباب اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ شباب کے لئے انقلاب۔ شباب کے بغیر انقلاب بے کار ہے اور انقلاب کے بغیر شباب۔ عوام کو چاہئے کہ شباب و انقلاب ایک ساتھ استعمال کریں۔ ورنہ خط و کتابت صیغہ راز میں نہ رکھی جائے گی۔ پیکنگ و محصول ڈاک بذمہ انجمن تجارت پسند مصنفین۔

نظم اچھی خاصی ہے اگر بقید قافیہ کہی جاتی تو اور زیادہ اچھی ہوتی۔ رفیق دواخانہ صاحب کی شاعری ابھی تجرباتی دور سے گزر رہی ہے۔ پھر بھی ان کا ہر نقش اول نقش ثانی سے بڑھ چڑھ کر ہوتا ہے۔ خدا کرے وہ اس میدان سے بھاگ نہ جائیں۔ کیونکہ قوم کی بہت سی امیدیں ان سے وابستہ ہیں۔ خصوصاً قوم کے بچے آگے چل کر ان کی رہنمائی کی ضرورت محسوس کریں گے۔ اس لئے کہ وہ صاحب شباب و انقلاب ہیں۔

حضرت راجستھانی صاحب کی نظم "کنٹھ سدھار" مشاعرہ الٹ دینے والے شعراء کے لئے ایک "لمحہ فکریہ" ہے۔ تکنیک کے لحاظ سے نظم بہت اونچی ہے...... نظم کا مرکزی خیال ہے:-

سارے گا ما پا دھانی سا
سانی دھاپا ماگا رے سا
سارے گاما پا دھانی ساساخ...... ساخ...... ساخر...... خخخ

جب "خر.....نحٹ" کی نوبت آ جائے تو___ بہرحال نظم بلا مقصد نہیں کہی گئی ...... راجستھانی صاحب اردو کے خادم ہی نہیں بلکہ زر خرید غلام معلوم ہوتے ہیں۔ اس لئے شعرائے کرام پر ان کی خدمت واجب و لازم ہے۔

"اختلاج نمبر" میں جہاں اس قسم کے نادر و نایاب نمونے پائے جاتے ہیں۔ وہاں دو چار بھرتی کی بھی چیزیں ملتی ہیں۔ مثلاً سلیم سلیمانی کا افسانہ "شہتوت کی چھاؤں میں" کریم کرمانی کی نظم "ٹوٹا ہوا ساز" صمد صمدانی کی تنقید "اردو افسانہ نگاری" ہمدم ہمدانی کا ڈرامہ "افق کے پار" وغیرہ وغیرہ۔

ایک اور چیز دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ادارہ چرائے ہوئے مضامین کیونکر چھاپ دیتا ہے۔ بلغم جلال آبادی کا افسانہ "اندھیرے کمرے میں" حضرت کوکا پنڈت آنجہانی کی مشہور تصنیف سے براہ راست چرایا گیا ہے۔ وہی خیالات ...... وہی انداز بیان ...... وہی سرسراہٹیں ...... وہی کلبلائیں ...... حتیٰ کہ بلبلاہٹیں بھی وہی ہیں۔ ادارہ کو چاہئے کہ چرائے ہوئے مضامین کسی قیمت پر نہ چھاپے۔ اس سے رسالہ کے وقار کو دھکا لگنے کا اندیشہ ہے۔

بہرحال "اختلاج نمبر" بحیثیت مجموعی ایک شاندار ادبی کارنامہ ہے۔ شاندار یوں کہ ادبی ہے اور ادبی اس لئے کہ شاندار ہے ...... ادب بہرحال شاندار ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض اوقات پسند کے جھگڑے میں "بےادبی تک کی نوبت آجائے"۔

بہرحال ادارہ "نیا خفقان" نے اختلاج کی اہمیت واضح کرنے کی جو کامیاب کوشش کی ہے اس کے لئے قوم ہمیشہ ممنون و مشکور رہے گی۔ اس وقت قوم کے لئے اختلاج بہت ضروری ہے۔ کیونکہ اختلاج ہی ایک ایسی چیز ہے جس کے ہاتھوں قومیں نہ صرف نشو و نما پاتی ہیں بلکہ نشو و نما پائی ہوئی قومیں سنور بھی جاتی ہیں ...... دیکھئے نا امریکہ میں کتنا زبردست اختلاج ہوا تھا ...... فرانس میں کتنا عظیم الشان اختلاج ہوا تھا۔ نتیجہ کے طور پر امریکی اور فرانسیسی قومیں آج کل کتنی خوشحال ہیں۔ لیکن آہ ہمارہ ملک "خمیرا

مروارید پسندوں" کا ملک ہے جو صدہا برس سے "آنے پائی" کے حساب میں جکڑا چلا آتا ہے اور اختلاج کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اگر کوئی شغل مسلسل اختیار کر لیا جائے تو اختلاج کا امکان ہی نہیں رہ جاتا ...... لہٰذا آنے پائی کے "شغل" نے ملک کو اختلاج سے کوسوں دور کر رکھا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ "اختلاج نمبر" اس سلسلہ میں مشعل ہدایت ثابت ہو گا۔

ہم ایک بار پھر نہایت خلوص اور گرم جوشی کے ساتھ ادارہ "نیا خفقان" کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ان کا آئندہ کارنامہ "انتقال نمبر" ہو گا۔

جگانے والے

اب کی بار جو جھٹکا لگا تو مولانا کمال کامریڈ سدھیر پر گرے۔ گاڑیبان نے بیلوں کی دموں پر گدگدی کی۔ گاڑی یونہی ڈھلوان راستے پر چل رہی تھی۔ گدگدی ہوتے ہی بیلوں نے بے تحاشہ دوڑنا شروع کیا۔ مولانا سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ تینوں کامریڈ ان پر آ رہے۔

"مار ڈالا" مولانا چیخے۔

مولانا بھنائے اور چاروں کامریڈ ہنسنے لگے۔

ان چاروں کامریڈوں نے اپنی اصطلاح میں مولانا کے گاؤں پر "ریڈ" کیا تھا۔ یہ چاروں بی اے کے طالبعلم تھے ــــ اور مولانا ایم اے کے۔ پانچوں میں گاڑھی چھنتی تھی۔ اکثر چھٹیوں میں یہ چاروں مولانا کے گاؤں پر مرغ مسلم، بھنی ہوئی بیٹروں اور مچھلی کے کبابوں کے لئے "ریڈ" کیا کرتے تھے۔ مولانا کی یہ "دہریہ نوازی" حلقہ احباب میں اچھی نظروں سے دیکھی جاتی تھی۔ مولانا کا یہ خیال تھا کہ یہ سب سے پہلے انسان ہیں۔ اس کے بعد "دہریئے" ــــ چنانچہ کامریڈ موہن اکثر علی الاعلان کہا کرتے تھے کہ مولانا بھی بہت جلد لال جھنڈے کے نیچے آ جائیں گے۔ مولانا یہ سن کر استغفار پڑھتے، منہ پیٹتے، کان پکڑ کر اٹھتے بیٹھتے اور قبلہ رو ہو کر وہ دن آنے سے پہلے مر جانے کی دعا مانگا کرتے تھے۔

مولانا بی اے میں صرف "کمال" تھے۔ مگر ایم اے میں پہنچتے ہی مولانا کمال

ہو گئے۔ ٹھوڑی پر تین چار بال رکھ لئے تھے۔ جنہیں فخریہ ڈاڑھی کہا کرتے تھے۔ ڈاڑھی والا حادثہ بھی عجیب تھا...... ہوا یہ کہ ایک دن آپ اپنے ایک دوست کی تلاش میں لیبارٹری کی طرف نکل گئے...... آپ کے دوست لیبارٹری میں بیالوجی اسسٹنٹ سے باتیں کر رہے تھے...... قریب ہی کچھ لڑکیاں کھڑی ایک جرمن سائنس دان کی تصویر دیکھ رہی تھیں۔

"ان جرمنوں پر ڈاڑھی کتنی کھلتی ہے۔" ایک لڑکی بولی۔

"اگر ڈاڑھی نہ ہوتی تو یہ اتنا قابل بھی نہ معلوم ہوتا" دوسری نے کہا۔

مولانا نے دیوار پر لٹکی ہوئی تصویر کو غور سے دیکھا...... واقعی یہ جرمن سائنس دان ڈاڑھی میں بڑا قابل معلوم ہو رہا تھا۔ دوسرے دن جب مولانا شیو کرنے بیٹھے تو ایک عدد فرنچ کٹ ڈاڑھی کی بنیاد پڑ گئی۔ مگر یہ ہمارے طالب علم اتنے بدھو ہوتے ہیں کہ انہوں نے کمال کو قابل سمجھنے کے بجائے مولانا کہنا شروع کر دیا۔ مولانا کا دل ٹوٹ گیا۔ انہوں نے سوچا کل شیو کرتے وقت قابلیت کا صفایا کر دیں گے۔ مگر واہ رے مقدر ــــ اسی دن لائبریری میں ایک لڑکی بڑی دیر تک ٹکٹکی لگائے ان کی طرف دیکھتی رہی۔ اب مولانا کو ڈاڑھی میں قابلیت کے بجائے حسن نظر آنے لگا ...... اس کے بعد لڑکے انہیں مولانا کہتے رہے اور وہ خوش ہوتے رہے۔

موہن، رشید، سدھیر اور شکیل چاروں ہائی اسکول میں مولانا کے ہم جماعت رہ چکے تھے۔ کالج میں بھی پانچوں ساتھ ہی داخل ہوئے تھے۔ یونیورسٹی میں بھی بی اے تک ساتھ رہا۔ اس کے بعد مولانا ایم اے میں پہنچ گئے اور یہ چاروں چونکہ بی اے میں پہنچنے کے بعد ہی کامریڈ بننے کی پریکٹس کرنے لگے تھے۔ اس لئے مولانا کا ساتھ نہ دے سکے۔ کمیونسٹ پارٹی کے یہ چاروں "ہمدرد" ایک دوسرے کو کامریڈ کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔ مقامی پارٹی آفس کے ممبروں سے جان پہچان رکھتے تھے اور

کبھی کبھار وقتی ضرورت کی بناء پر حسب حیثیت پارٹی کی مالی امداد بھی کر دیا کرتے تھے۔ "قومی ترانہ" کے پلندے بغلوں میں داب کر یونیورسٹی لان پر چہل قدمی کیا کرتے تھے اور ہوٹلوں میں بیٹھ کر بھوک اور سرمایہ داری پر گرما گرم بحثیں کیا کرتے تھے ..... بہرحال وہ کامریڈ تھے اس لئے "قومی ترانہ" چائے، سگریٹ، چپل اور عینک سبھی لوازمات ان کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔

مولانا کے گاؤں سے لوٹتے وقت یہ چاروں مولانا سمیت کنور سلیم کے علاقہ پر "ریڈ" کرنے والے تھے۔ کنور سلیم جنک پور کے جاگیردار کے اکلوتے لڑکے اور مولانا کے کلاس فیلو تھے۔ کنور صاحب بہت ہی مستقل مزاج آدمی تھے۔ شاید اسی لئے ایم اے کے پہلے سال میں یہ ان کا پانچواں سال تھا۔ اکثر فخریہ کہا کرتے تھے کہ میں نے متقدمین کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ متاخرین پر رعب جمایا ہے۔ بھلا آپ لوگ میرے آگے کیا ہیں۔

مولانا کے گہرے دوستوں میں سے تھے ..... مولانا ہی کی وجہ سے رشید، شکیل، موہن اور سدھیر سے بھی دوستی ہو گئی تھی ورنہ اس سے پہلے کنور صاحب نے اپنے سے نیچے درجہ کے طالبعلموں کو "لفٹ" نہیں دی تھی۔ کنور صاحب ان چاروں کو پسند کرتے تھے ..... اس لئے پسند کرتے تھے کہ چاروں مغرور نہیں تھے اور ان کی باتوں سے کافی محظوظ ہوا کرتے تھے۔ ان کے معمولی سے معمولی جملے پر ہنستے ہنستے لوٹ جایا کرتے تھے۔ کنور صاحب جس وقت اپنے پردادا مرحوم بھورے نواب صاحب کے کارنامے بیان کرتے تو یہ چاروں حیرت اور تجسس کے طوفان اٹھا دیا کرتے تھے۔ ایک بار کنور صاحب نے اپنے پردادا مرحوم کی پرتگالی شراب کے دفینے کا تذکرہ کیا تو ان چاروں کی رال ٹپکنے لگی۔ بھورے نواب صاحب کی پرتگالی شراب تقریباً ڈیڑھ سو سال سے کنور صاحب کے خاندان پر مسلط تھی۔ یہ ذخیرہ کسی صورت سے کم ہی نہ ہوتا

تھا..... ان کے پردادا صرف کرتے رہے۔ اس کے بعد دادا صاحب اس خزانے کے مالک ہوئے اور وہ بھی نہ صرف ضیافتوں کے سلسلہ میں بلکہ روزانہ استعمال کرتے رہے۔ پھر والد صاحب نے اس خاندانی سرمایہ پر قبضہ کیا اور مفت خزانہ اپنے انداز میں زبانی اور عملاً دونوں طرح استعمال کرتے رہے۔ اب کنور صاحب کا بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ مگر پرتگالی شراب گویا کوزہ میں سمندر ہو کر رہ گئی تھی..... ڈیڑھ سو سال پرانی شراب کا تذکرہ سن کر چاروں کامریڈوں نے چار عدد سرد آہیں بھریں اور ایسا منہ بنایا جیسے قیامت تک ان کے ہونٹ اس تک نہ پہنچ سکیں گے۔ مولانا پر اس کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا کیونکہ وہ بھی خاندانی رئیس تھے۔ ان کے خاندان پر بھی اگر پرتگالی نہ سہی تو کم از کم بیروت کی انگوری شراب ضرور چھائی رہی ہو گی۔ کنور سلیم نے ان چاروں کی ادا سی بھانپ کر وعدہ کر لیا تھا کہ وہ کسی نہ کسی موقع پر ان لوگوں کو ضرور مدعو کریں گے۔ چنانچہ چھٹیوں سے قبل جب ان لوگوں نے مولانا کے گاؤں پر "ریڈ" کرنے کا پروگرام بنایا تو کنور صاحب نے کہا کہ واپسی میں وہ ان کے علاقے پر ضرور آئیں۔

اس وقت یہ چاروں بیل گاڑی کے جھٹکے کھاتے اور پرتگالی شراب کے خیالی جام پیتے۔ جنک پور کی طرف کھنچے چلے جا رہے تھے۔ آج یہ چاروں ضرورت سے زیادہ چہک رہے تھے۔ بیل گاڑی گرد کے بادل اڑاتی ہوئی ڈھلوان راستے پر چلی جا رہی تھی۔ گاؤں والوں کے قافلے کے قافلے میلہ دیکھ کر اپنے گاؤں کو واپس ہو رہے تھے ..... "اف یہ دھرتی کی بیٹیاں" کامریڈ موہن جو ان لڑکیوں کی قطار دیکھ کر گنگنائے.....

"ذرا طبیعت روک کر" مولانا بولے، "ورنہ ان دھرتی کے بیٹوں کے لٹھ دیکھے ہیں نا تم نے"۔

کامریڈ سدھیر گنگنائے ع " آہ تپتی ریت میں یہ پھول سے کومل شریر "

" چپ رہو بھائی سدھیر " کامریڈ رشید نے آزاد نظم کا دوسرا مصرعہ عنایت کیا۔

" ورنہ دیہاتی گنوار " مولانا نظم مکمل کرنے پر تل گئے۔

" توڑ ڈالیں گے تمہاری ہڈیاں اور پسلیاں "

" کھینچ لیں گے تم کو گاڑی سے ابھی "

" اور کہیں گے آؤ دھرتی کی حسین چمگادڑو "

" آ کے اس ہمدرد کو حلوہ کھلاؤ "

" اور تپتی ریت میں کومل شریر "

" ایک چرواہے کی اونٹنی کی طرح بل کھائے گا " ۔

" ایک چرواہے کی اونٹنی کی طرح بھائی سدھیر "

" ہائے چرواہے کی اونٹنی کیا کروں "

" اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں "

" اڑالو مضحکہ " کامریڈ رشید سرہلا کر بولے " ہونے دو انقلاب ...... خچر دم میں نہ بندھوا دیا تو سہی "

گھبراؤ نہیں مذہبی دور عنقریب شروع ہونے والا ہے ...... چالیس چالیس درے لگوائے بغیر سگریٹ نہ پیونگا۔ " مولانا چہک کر بولے۔

" مذہبی دور " کامریڈ سنجیدہ ہو کر بولے۔ پھر یکایک ایسا معلوم ہوا جیسے اچانک شدید قسم کا دورہ پڑ گیا ہو۔ چہرہ سرخ ہو گیا۔ گردن کی رگیں تن گئیں۔ آنکھیں ابل پڑیں اپنی پوری قوت سے چیخ کر بولے " مذہبی دور ؟ "

ایسا معلوم ہوا جیسے یہ دورہ چھوت کی بیماری کی طرح یکے بعد دیگرے چاروں

پر حملہ کر بیٹھا ہو......

مولانا اور زیادہ چیخ کر بولے " ہاں ہاں مذہبی دور ــــ تم سب فی النار والسقر ہو جاؤ گے " ۔

اتنے میں اچانک ایک بیل چلتے چلتے بیٹھ گیا...... جھٹکا جو لگا تو پھر پانچوں ایک دوسرے پر گرے۔

" اوہ یہ بیل گاڑی " کامریڈ رشید دانت پیس کر آہستہ سے بولے۔

" دھرتی کے بیٹوں کی موٹر کار کہو " مولانا نے ایسی سنجیدگی سے کہا جس میں ابھی تک جلال کی جھلکیاں موجود تھیں......

" مت بکو " کامریڈ رشید جھنجھلا کر بولے " مضحکہ اڑانے سے یہ آگ نہیں دب سکتی...... پھیلے گی اور پھیلے گی...... وہ دن دور نہیں جب سونے کی ہڈی چچوڑنے والے بلڈاگ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائیں گے ...... کیا حق حاصل ہے تمہیں کہ ان رینگتی ہوئی لاشوں کے منہ سے نوالا چھین کر اپنی توند بھرو۔ ان ننگی بھوکی آتماؤں کو خاک میں ملا کر حویلیاں کھڑی کرو...... ان خون اگلتی ہوئی حسیناؤں کے چہروں کی چمک چھین کر اپنے شبستان میں اجالا کرو...... تم چاہتے ہو کہ یہ سوتے رہیں یونہی قیامت تک سوتے رہیں...... کبھی نہیں...... ہم جگائیں گے انہیں...... بالآخر جگائیں گے ...... تم بہت دنوں تک ان پر مذہب کی چادر ڈال کر انہیں تھپکیاں دے دے کر سونے پر مجبور نہ کر سکو گے ...... یہ جاگ اٹھیں گے ...... دھرتی کے بیٹے چونک اٹھیں گے ...... ہم جگائیں گے انہیں......

" اچھا اچھا بہت ہو چکا " مولانا اور زیادہ سنجیدہ ہو گئے " خدا کی شان میں بے ادبی نہ کرو۔ خدا نے کیا بگاڑا ہے تمہارا ...... ڈرو اس دن سے جب اس کے سامنے جاؤ گے ...... تم خود سو رہے ہو۔ دوسروں کو کیا جگاؤ گے ...... تم میں اتنی سکت کہاں۔

کافروں کی چوسی ہوئی ہڈیوں کو چچوڑنے والے پہلے خود تو اپنے پیروں پر کھڑے
ہولیں۔ پھر دوسروں کو اٹھائیں گے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

تم خدا کو برا بھلا کہتے ہو...... آخر کیوں؟ ...... محض اس لئے کہ ذلت کی زندگی
بسر کر رہے ہو۔ جانتے ہو! تم خدا کے انعام کے قابل نہیں...... خودی پیدا کرو...... اور
پھر تم اتنے بلند ہو جاؤ گے...... اتنے بلند ہو جاؤ گے......

"خودی؟" کامریڈ رشید نے نفرت سے ہونٹ سکوڑتے ہوئے کہا "جی......
یہ خودی بھی آپ کے ڈرائنگ روم کی پیداوار ہے...... ذرا ڈرائنگ روم سے باہر آؤ
...... کوچہ و بازار میں جسم دیکھو۔ امراض کے تنوروں سے نکلے ہوئے اجسام دیکھو......
پیپ بہتی ہوئی ناسوروں سے دیکھو...... کہاں جا کر مر رہی ہے تمہاری خودی...... وہ
دیکھو طوائف کوٹھے کے نیچے سے تمہاری خودی کا جنازہ جا رہا ہے"۔

"تم خود اس کے ذمہ دار ہو" مولانا جوش کے ساتھ بولے "تم نے خودی
کے بجائے بے خودی پیدا کی ہے...... تم نے بے خود ہو کر گناہ کئے...... اور ان کی سزا
تمہیں یہ ملی کہ تم امراض کے تنوروں سے نکل پڑے۔ تمہارے ناسوروں سے پیپ
بہنے لگی...... تم طوائف ہو گئے چپ رہئے سدھیر صاحب مجھے کہنے دیجئے میرے سینے میں
آگ لگی ہے۔ آپ جملوں کی نوعیت اور مذکر و مونث میں پڑے ہوئے ہیں اور یہاں
دنیا تباہی اور گمراہی کی طرف بھاگی جا رہی ہے......

"چپ رہو" کامریڈ رشید پوری طاقت سے چیخے۔ "میں جگاؤں گا"......

"تم کیا جگاؤ گے؟ میں جگاؤں گا" مولانا بھی چیخے۔

"میں چیخ بن کر ان کے کانوں میں کود پڑوں گا" کامریڈ رشید اور زور سے

چیخے۔

"میں صور قیامت لے کر ہمالیہ کی سب سے اونچی چوٹی پر چڑھ جاؤں گا"۔
مولانا اتنی زور سے چیخے کہ گاڑیبان نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔

"مت بکو"

"مت بھونکو"

دونوں خاموش ہو کر ایک دوسرے کو کھا جانے والی نظروں سے گھورنے
لگے۔

اور اب مکمل سکوت تھا...... بیلوں کے گھنگھروؤں اور پہیوں کی چوں چرخ
چوں نے ایک نیا راگ چھیڑ دیا تھا...... گاڑی بان اونگھنے لگا تھا...... جب گاڑی کی رفتار
مدھم ہو جاتی تو چونک کر دو چار گالیاں بکتا اور بیلوں کی دم اینٹھ کر پھر اونگھنے لگتا......
کامریڈ رشید آنکھیں پھاڑے دور افق میں دیکھ رہے تھے...... کامریڈ سدھیر اور موہن
گداز جسموں والیوں اور پھیلے پھیلے کاجل میں چمکتی ہوئی آنکھوں والیوں پر آہستہ
آہستہ تبصرہ کر رہے تھے...... مولانا بھی کچھ سوچ رہے تھے...... یکایک کھل کھلا کر ہنس
پڑے...... اتنی زور سے ہنسے کہ کامریڈ شکیل اونگھتے اونگھتے چونک پڑے اور گاڑی بان
نے ہوشیار ہو کر بیلوں کو ایک بہت ہی چکیلی قسم کی گالی دی......

"خیریت؟" کامریڈ شکیل پلکیں جھپکاتے ہوئے بولے۔

"جگا رہا ہوں" مولانا نے قہقہہ لگا کر کہا......

"کیوں بور ہو رہے ہو" شکیل نے دوبارہ اونگھنے کا اردہ کرتے ہوئے
کہا۔

کامریڈ رشید نے مولانا کو گھور کر دیکھا اور دوسری طرف منہ پھیر لیا......
پھر سکوت چھا گیا...... تھوڑی دیر بعد چاروں کامریڈ اونگھنے لگے...... مولانا

برابر سوچ سوچ کر مسکرائے جارہے تھے۔ انہیں پہلے کا واقعہ یاد آرہا تھا...... میلے میں گھومتے گھومتے اچانک کامریڈ رشید پر "تجربہ" کرنے کا دورہ پڑا تھا۔ آپ نے دیہاتیوں کے ایک گروہ کو روک کر آنے والے انقلاب کی "بشارت" دی سب حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ کامریڈ رشید نے سب سے پہلے انہیں ان کی صحیح "پوزیشن" سے آگاہ کیا اور اس کے بعد اقتصادی اور معاشی مسائل پر اتر آئے...... دیہاتی حیرت سے منہ پھاڑے ان کے ہاتھوں کی حرکت کے ساتھ ساتھ دیدے پھرا رہے تھے...... آپ سب سے پہلے انگریزی بولتے، اس کے بعد اردو میں اس کا ترجمہ کرتے اور پھر انہیں سمجھانے کی کوشش کرتے...... ان کا جسم ان کی زبان کے ساتھ ساتھ اس تیزی سے حرکت کر رہا تھا کہ مولانا کو انگریزی کے فلمی کارٹون کا مزہ آنے لگا۔

تقریر کرتے کرتے آپ "پروڈکشن" پر اٹک گئے...... کئی بار گردن جھٹکنے کے باوجود بھی "پروڈکشن" کا ترجمہ ذہن میں نہ آیا...... ایک بوڑھے کی طرف دیکھ کر کہنے لگے، "پروڈکشن ــــ پروڈکشن، یعنی کہ ...... یعنی کہ ......پروڈکشن سمجھتے ہو؟"

بوڑھے نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑی معصومیت سے سر ہلا کر کہا تھا۔

"ناہیں صاحب! مگر تحصیلدار صاحب کو جانتا ہوں۔

مولانا ہنس پڑے تھے اور کامریڈ رشید کو کوفت ہو رہی تھی۔ بہرحال کامریڈ رشید کا "تجربہ" ناکام رہا تھا...... جس وقت مجمع برخاست ہوا تھا تو ایک بے ڈھنگے سے دیہاتی نوجوان نے ہنس کر کہا "ہم سمجھے شاید سالا بخار کی دوا بانٹتا ہے۔ مولانا یہ سن کر ہنستے ہنستے دوہرے ہو گئے تھے اور جب بھی اس واقعہ کے متعلق سوچتے انہیں بے اختیار

ہنسی آجاتی...... اس وقت بھی ان کی ہنسی کی محرک یہی چیز تھی۔ وہ سوچتے عجیب بات ہے کہ سونے والے ان کامریڈ صاحب کی چیخ کو مسخرا پن سمجھتے ہیں۔ مولانا نے اس حادثے کا خوب مضحکہ اڑایا...... کامریڈ رشید اسی پر اڑے رہے کہ "انہیں جاگنا ہی پڑے گا" مولانا نے کہا تھا کہ مذہب کو درمیان میں لا کر انہیں جو کچھ سمجھاؤ اسے اتنی ہی آسانی سے سمجھ لیں گے جتنی آسانی سے ہواؤں کا رخ دیکھ کر بارش کی آمد "سونگھ" لیتے ہیں۔ ان سے اگر یہ کہہ دو کہ زمیندار کو لگان نہ دو مذہب یہی کہتا ہے تو یہ جان دے دیں گے مگر لگان نہ دیں گے۔ کامریڈ رشید اس پر اپنے ہونٹوں میں تنفر آمیز کھچاؤ پیدا کر کے خاموش ہو گئے تھے۔

چاروں کامریڈ اونگھ رہے تھے...... کچھ دیر بعد مولانا بھی اونگھ گئے...... پانچوں اونگھتے رہے اور گاڑی رینگتی رہی۔ حتیٰ کہ جاگیردار صاحب کی حویلی آگئی ...... پانچوں چونکے ــــ اطلاع ملتے ہی کنور صاحب نے انہیں اندر بلایا...... ڈرائنگ روم بہت ہی شاندار تھا...... چاروں کامریڈ ہر چیز کا بغور جائزہ لینے لگے...... کنور صاحب جو ضرورت سے زیادہ محظوظ ہو رہے تھے۔ تعارف کرانے لگے "یہ گلدان دادا جان کو ایک چینی سیاح نے بطور تحفہ دیا تھا۔ یہ مجسمہ والد صاحب پیرس سے لائے تھے...... یہ تصویر لارڈ ولزلی نے پردادا مرحوم کو ان کی سالگرہ کے موقع پر عنایت کی تھی...... اوہ یہ اگالدان! چنگیز خاں کا ہے...... وہ دیکھئے یہ اس ہرنی کی سینگیں ہیں جس کی یاد میں جہانگیر نے ہرن مینار تعمیر کرایا تھا...... اوہ یہ شیر کی کھال...... میں نے......"

"اور یہ صوفہ سیٹ؟" مولانا بات کاٹ کر بولے۔

"یہ یہیں خریدا گیا تھا" کنور صاحب نے بے دلی سے جواب دیا۔

"میں سمجھا شاید ازبکستان......"

"اوہ نو نو ڈیئر" کنور صاحب سر ہلا کر بولے "یہ آپ اور رشید صاحب کچھ

کھنچے کھنچے سے کیوں نظر آ رہے ہیں۔ "

"مذہب پر جھگڑا ہو گیا ہے" کامریڈ شکیل نے کہا۔

"اوہ نو نو ڈیئر ــــ مذہب بھی کوئی لڑنے کی چیز ہے" کنور صاحب نے سنجیدگی سے کہا "لڑائی تو صرف تین چیزوں پر ہونی چاہئے زر، زن اور زمین" ۔

تھوڑی دیر اسی قسم کی گفتگو ہوتی رہی۔ اس کے بعد پانچوں کو غسلخانہ دکھایا گیا۔

شام کو پائیں باغ میں گہرے سرخ رنگ کی پرتگالی شراب کے دور چلنے لگے۔ کامریڈ رشید پر جیسے بولنے کا دورہ پڑ گیا تھا۔ کمیونزم سے متعلق اب تک جتنی کتابیں رٹی تھیں۔ سب دہرا گئے۔ درمیان میں تینوں کامریڈ بھی بول پڑتے تھے۔ مولانا الغزالی، الکندی اور رازی پر اتر آئے تھے ...... کنور سلیم خاموش تھے۔ ان کی آنکھیں نشے سے بوجھل ہوئی جا رہی تھیں ــــ کبھی کبھار صرف ہنس دیتے تھے۔ اچانک کامریڈ رشید گفتگو کا رخ بدل کر گھسیٹ گھسیٹ کر بولے "یہ گلاس ــــ اس گیلاس میں ــــ غری ــــ بوں کا ــــ لوہو ــــ ہے"

"اوہ نو ڈیئر ــــ اس میں پرتگالی شراب ہے، ڈیڑھ سو سال پرانی" کنور صاحب نے انقلابی نظم کے پہلے ہی مصرع پر اصلاح دی۔

"نائیں ــــ غری ــــ بوں کا لوہو ہے ــــ او ــــ او ہو ہو ہو ہہ" کامریڈ رشید زار و قطار رونے لگے۔ کامریڈ سدھیر نے بھی "ہو ہو" کی ہانک لگائی آہستہ آہستہ چاروں رونے لگے ...... مولانا نے اپنا گلاس خالی کر کے بڑے زور سے قہقہہ لگایا......

"اوہ نو نو ڈیئر تم سب گاؤ" کنور صاحب نے کہا اور اپنی بھاری بھرکم آواز میں گانے لگے "ناچو ناچو پیارے من کے مور"

"ہام ناچ ــــ چیں" کامریڈ رشید جھوم کر اپنے سینے پر انگلی مارتے ہوئے بولے۔

"ناچو" کنور صاحب بھی جھوم کر بولے۔

کامریڈ رشید نے اٹھ کر ایک ہاتھ سر پر رکھا اور دوسرا کمر پر اور باقاعدہ ناچنے لگے ..... تھوڑی دیر تک خاموشی سے ناچتے رہے اس کے بعد گا گا کر ناچنے لگے یہ غریبوں کا لہو ہے۔ یہ غریبوں کا لہو ــــ تاک دھنا دھن تاک دھنا دھن ــــ انقلاب زندہ باد ــــ تاک دھنا دھن ــــ تاک دھنا دھن ــــ انقلاب زندہ باد" مولانا ران پر طبلہ بجا بجا کر گانے لگے "اللہ باقی من کل فانی ــــ اللہ باقی من کل فانی"

"تاک دھنا دھن ــــ تاک دھنا دھن ــــ انقلاب زندہ باد"

"اللہ باقی من کل فانی"

"تاک دھنا دھن زندہ باد"

چاروں کامریڈوں نے مل کر گانا شروع کیا "تاک دھنا دھن زندہ باد ــــ تاک دھنا دھن زندہ باد"

"اللہ باقی من کل فانی" مولانا بھی اٹھ کر ناچنے لگے......

کنور صاحب نے اتنے زور سے قہقہہ لگایا کہ لان چیئر سمیت الٹ گئے......

پرتگالی شراب کی خالی صراحیوں پر شفق رنگ مار رہی تھی۔

ایک یادگار مشاعرہ

اردو مڈل میں فیل ہونے کے بعد میں نے پان بیڑی سگریٹ کی چھوٹی سی دوکان کھولی۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ آج کل ایم اے، بی اے پاس لوگوں سے کوئی جوتے میں پالش بھی نہیں کرواتا یا یہ سمجھ لیجئے کہ یہ لوگ اپنی نامعقولیت کی بناء پر خود نہیں کرتے۔ لہٰذا میں نے سوچا کہ مڈل پاس کرنے میں جتنا عرصہ لگے گا۔ اتنے دنوں میں کم از کم میں اپنے پیروں پر تو ضرور کھڑا ہو جاؤں گا اور پھر اگر میں نے مڈل پاس بھی کر لیا تو کون سا بڑا تیر ماروں گا۔ جب کہ اچھے اچھے پڑھے لکھوں سے لوگ کہہ بیٹھتے ہیں۔ ـ کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو۔

اور مجھے نکتہ چینیوں سے یوں بھی انتہائی نفرت ہے۔ اس لئے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ تجارت ہی کی جائے۔ ابھی تین ہی ماہ تجارت کی تھی کہ اچانک ایک حادثہ کے تحت شادی بھی کرنی پڑی اور آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ میری بیوی کو جہیز میں ایک بھینس ملی۔ یہ عمارت جو آپ دیکھ رہے ہیں نا یہ اسی بھینس نے بنوائی ہے۔ آپ تعجب کریں گے لیکن میں آپ سے حلفیہ کہتا ہوں...... سنئے ہوا یوں کہ میں نے پان بیڑی سگریٹ کے ساتھ ہی ساتھ دودھ بھی بیچنا شروع کر دیا۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ دودھ کی تجارت بڑی منفعت بخش ہوتی ہے۔ میں آہستہ آہستہ ترقی کرنے لگا اور آج تو خیر سے کئی شہروں میں میری ڈیریاں ہیں۔

میں نے جنگ کے زمانے میں دل کھول کر چندہ دیا۔ اس لئے سرکار انگلشیہ

کے حضور مجھے ۱۹۴۵ء میں شمس العلماء کا خطاب عطا ہوا۔

اس شہر کے کئی یتیم خانوں اور تعلیمی اداروں کی سرپرستی کر رہا ہوں۔ کئی بار متعدد جلسوں کی صدارت بھی کر چکا ہوں اور اب بھی جب موقع ملتا ہے صدارت سے باز نہیں آتا۔

آج صبح جب دفتر میں بیٹھا حساب کر رہا تھا دو تین حضرات ایک مشاعرے کی صدارت کا دعوت نامہ لے کر آئے۔ کسی مشاعرے کی صدارت کرنے کا میرے لئے یہ پہلا موقع تھا۔ لہٰذا میں نے اسے ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

"اس مشاعرے کی غرض قومی خدمت ہے"۔ ایک صاحب بولے۔

"اور آپ جیسا قوم کا ہمدرد ہمیں اس زمانے میں تو نظر نہیں آتا"۔ دوسرے نے کہا۔

"اسی لئے ہم آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں"۔ تیسرے صاحب بولے۔

"یہ مشاعرہ دراصل چندے سے ہو رہا ہے"۔ تیسرے صاحب جیب سے رسید بک نکال کر اس پر کچھ لکھتے ہوئے بولے۔ "مشاعرے کی آمدنی سے ایک مرغی خانہ کھولا جائے گا اور مرغی خانے کی آمدنی سے ایک یتیم خانے اور یتیم خانے میں قوم کے لاوارث بچے"۔

انہوں نے رسید کاٹ کر میری طرف بڑھا دی۔

"مگر...... مگر" میں پانچ سو کی رقم دیکھ کر ہکلایا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ یہ قلیل رقم آپ کے شایان شان نہیں...... لیکن ہم اس سے زیادہ تکلیف دینا نہیں چاہتے۔" تیسرے صاحب رسید بک لپیٹ کر جیب میں رکھتے ہوئے نہایت اطمینان سے بولے۔

کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے میں نے چیک بک نکال کر پانچ سو کا چیک کاٹ دیا۔

"شکریہ" ایک نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ہم میں سے کوئی ۱۵ر دسمبر کو آپ کی خدمت میں حاضر ہو جائے گا"۔

ان لوگوں کے جاتے ہی میں سوچنے لگا۔ پانچ سو روپے میں یہ صدارت کچھ زیادہ مہنگی نہیں پڑی اور پھر سب سے بڑی بات تو یہ کہ پبلک بھی مجھ سے واقف ہو جائے گی۔ ان کی دیکھا دیکھی اور دوسرے شہروں کے لوگ بھی مجھے مدعو کرنے لگیں گے ...... اور پھر ...... مگر مشاعرے میں شاید مجھے خطبہ صدارت بھی پڑھنا پڑے۔ پندرہ دسمبر کو ابھی دس روز باقی ہیں اتنے عرصے میں خطبہ لکھا اور رٹا جا سکتا ہے۔ میں نے حساب کا رجسٹر ایک طرف رکھ کر خطبہ صدارت لکھنا شروع کر دیا۔

"حاضرین و حاضرات و بانیان مشاعرہ۔ آپ نے بہت اچھا کیا کہ مجھے صدر بنا دیا۔"

لیکن یہ تو درست نہیں۔ اس میں تھوڑی سی خاکساری بھی ہونی چاہئے۔ لہٰذا میں نے اسے کاٹ کر دوسری سطر لکھنی شروع کی۔

"حاضرین و حاضرات و بانیان مشاعرہ۔ آپ نے مجھ جیسے گھامڑ آدمی کو صدر بنا کر انتہائی حماقت کا ثبوت دیا ہے ...... اس وقت مجھے مولوی محمد غالب علی صاحب کا شعر یاد آ رہا ہے۔

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

غالب علی صاحب بہت بڑے شاعر تھے۔ اتنے بڑے اتنے بڑے کہ کتنا بڑا کہا

جائے۔ ایک بار وہ سہارنپور سے فتح محمد پور جا رہے تھے راستہ میں انہیں ایک اللہ والے بزرگ ملے اور انہوں نے ان کو کچھ جڑی بوٹی کھلا دی پھر وہ بہت بڑے شاعر ہو گئے۔ اللہ والوں کا کیا کہنا ہمارے محلے میں بھی ایک مرد بزرگ رہتے ہیں۔ اولاد والوں کو بے اولاد کر دیتے ہیں۔ آنکھ والوں کو نابینا اور تندرست کو مجبور لاچار کر دیتے ہیں۔ میرے چھوٹے لڑکے کو بہت چاہتے ہیں۔ اس کو دلار میں بگوا کہتے ہیں۔ شعر و شاعری سے انہیں بہت دلچسپی ہے۔ آج کل انہیں بخار آ رہا ہے ورنہ میں ان کو اپنے ہمراہ ضرور لاتا۔

میں آپ سے قسمیہ کہتا ہوں کہ میں بہت نالائق آدمی ہوں۔ نرا چغد ہوں۔ آپ نے خواہ مخواہ مجھے صدر بنا دیا۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مجھے شعر و شاعری سے بہت دلچسپی ہے۔ وہ لکھنؤ کی منی جان ہیں نا انہوں نے صرف میرے لئے بہت سی غزلیں یاد کر رکھی ہیں۔ آپ نے شاید منی جان کو گاتے نہیں سنا۔ واللہ غضب کی چیز ہے۔ کیا گلا پایا ہے۔ کبھی لکھنؤ آیئے تو آپ کو مجرا سنواؤں۔

یہاں تک لکھنے کے بعد میں سوچنے لگا کہ تقریر میں موقع موقع سے کچھ اشعار ہونے چاہئیں۔ لہٰذا میں نے تقریر کو فوراً ہی سنبھال لیا اور لکھنا شروع کیا۔

بھائیو! مجھے یہ شعر بہت پسند ہے

آیا کرو ادھر بھی مری جاں کبھو کبھو
نکلیں ہمارے دل کے بھی ارماں کبھو کبھو

ایک بار منی جان اس شعر کو گا رہی تھی۔ سماں بندھا ہوا تھا کہ اچانک میں وہاں پہنچ گیا جس وقت اس نے کبھو کبھو کی تکرار شروع کی مجھے خون کی قے ہو گئی اور عرصہ تک پیچش میں مبتلا رہا۔ اب اللہ کے فضل سے بالکل ٹھیک ہوں لیکن ابھی قدرے نقاہت باقی ہے۔ اگر مر جاتا تو یہی ہوتا۔

لئے پھرتی ہے بلبل چونچ میں گل
شہید ناز کی تربت کہاں ہے

شہید ناز___اف۔ شاید آپ کو یاد ہو گا کہ آغا حشر کمپنی نے ایک ڈرامہ شہید ناز کھیلا تھا۔ صاحب مجھے تو بہت پسند آیا تھا۔ کچھ نہیں تو ساٹھ بار ضرور میں نے اس کھیل کو دیکھا ہو گا۔ اس میں ایک لڑکی کام کرتی تھی۔ اس کا نام گل خیرو تھا۔ ہائے ہائے کیا چیز تھی..... گل خیرو ایک دوا کا بھی نام ہے جو بواسیر کے لئے اکسیر ہے۔ بواسیر چاہے خونی ہو چاہے بادی۔ گل خیرو کو ابال کر چالیس دن صبح شام پی لیجئے خدا نے چاہا تو بالکل آرام ہو جائے گا۔ یہ ایک فقیر کا بخشا ہوا نسخہ ہے۔ میں نے کہیں پڑھا ہے کہ اردو کے بہت بڑے شاعر محمد غالب علی صاحب کے پاس برہان قاطع کے کئی نسخے تھے ..... لیکن میری سمجھ میں آج تک نہ آسکا کہ برہان قاطع کون سی بیماری ہے..... ممکن ہے پرانے زمانے میں رہی ہو..... اب نہ ہوتی ہو..... کون جانے.....

میں ایک بار پھر آپ سے کہوں گا کہ آپ نے مجھ جیسے الو کے پٹھے کو ناحق صدر بنا دیا۔ خیر اب آپ نے مجھے اس لائق سمجھا ہے تو میں خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ ہر ماہ ایک مشاعرہ کیا کروں گا لیکن میں ایک بات آپ سے عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ آپ لوگ مشاعرے میں بہت زیادہ "واہ وا" نہ کیا کیجئے۔ جب کوئی شعر پڑھتا ہے اور آپ لوگ "واہ وا" کرنے لگتے ہیں تو نہ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے ایک کتا کسی اونچی جگہ پر بیٹھا بھونک رہا ہو اور مجمع نیچے سے "دت دت" کر رہا ہو۔ اس لئے آپ واہ وا نہ کیا کیجئے..... ایک بات اور..... مجھے یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوتا ہے کہ ہمارے شعرائے کرام اپنی صحت کی بالکل پرواہ نہیں کرتے۔ چائے، شراب اور سگریٹ کثرت سے پیتے ہیں۔ اگر ان چیزوں کے بجائے وہ خالص دودھ اور تازہ مکھن استعمال کریں تو میں دعوے سے کہتا ہوں کہ ان کی شاعری کہیں کی کہیں جا پہنچے۔

میں آپ سے قسمیہ کہتا ہوں بلکہ حلف اٹھانے پر تیار ہوں کہ میری ڈیریوں میں آپ ہمیشہ خالص دودھ اور خالص مکھن پائیں گے۔ آپ کے شہر میں بھی میری ایک ڈیری ہے اگر آپ کو یقین نہ آئے تو آزمائش کر کے دیکھ سکتے ہیں۔

میں ایک بار پھر آپ کا شکریہ ادا کروں گا کہ آپ نے مجھ جیسے نالائق اور جانگلو کو اپنے مشاعرے کی صدارت کے قابل سمجھا۔ اب مشاعرے کی کاروائی شروع ہوتی ہے اس لئے۔

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

خطبہ صدارت لکھ چکنے کے بعد میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ۱۶ر دسمبر کو مشاعرہ تھا۔ ۱۴ر دسمبر تک میری یہ حالت ہو گئی کہ چھوٹے چھوٹے بچے مجھ سے خوف کھانے لگے۔ ہوا یہ کہ ایک دن ایک بچے نے مجھے تنہائی میں قد آدم آئینے کے سامنے خطبہ صدارت دہراتے دیکھ لیا۔ اس کے بعد ہی مجھے ایک عرصہ کے لئے بچوں سے نجات مل گئی۔

۱۶ر دسمبر کی رات کو ابھی مشاعرہ شروع ہونے میں کافی دیر تھی لیکن پنڈال میں تل رکھنے کو بھی جگہ نہ رہ گئی تھی۔

سیکرٹری صاحب نے آہستہ سے میرے کان میں کہا "یہ اس شہر کی تاریخ میں غالباً پہلا کامیاب مشاعرہ ہو گا"۔

"اچھا!" میں نے حیرت سے کہا۔

"یہ محض آپ کی صدارت کی وجہ سے ورنہ پچھلے سال بھی ہم نے مشاعرہ کیا تھا"۔

"ارے..... بھلا میں کیا..... ہی ہی ہی ہی!"

"نہیں واللہ یہ محض آپ کے نام کی جادو اثری ہے۔ اور پھر آج کون ہے جو دنیائے ادب میں آپ سے آنکھیں چار کر سکے۔ اگر میں یہ کہوں کہ اردو محض آپ کی وجہ سے زندہ ہے تو بے جا نہ ہو گا..... اگر آپ کی ہستی نہ ہوتی تو ہم یہ مشاعرہ کبھی نہ کر سکتے..... حالانکہ تین سو کا گھاٹا....."

"گھاٹے کی آپ پرواہ نہ کیجئے" میں نے جوش سے کہا۔

مشاعرہ شروع ہوا..... تھوڑی دیر تک مقامی شعراء اور شوقین طلبا کی حوصلہ افزائی کی جاتی رہی۔ اس کے بعد میں نے خطبہ صدارت پڑھا اور مشاعرے کی باقاعدہ کارروائی شروع ہوگئی۔ دو شاعر پڑھ چکے تھے۔ تیسرے کا نام پکارا ہی جا رہا تھا کہ ایک شور قیامت اٹھا۔ وجہ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ پبلک کے دو پسندیدہ شاعر گیٹ پر اڑ گئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جب تک سیکرٹری خود نہیں آئے گا ہم ڈائس پر نہ جائیں گے۔

سیکرٹری بیچارا ہوتا ہی اس لئے ہے..... لیکن دو عدد بگڑے ہوئے شاعروں کا سنبھالنا اس اکیلے کے بس کا روگ نہ تھا۔ اس لئے چند رضا کاروں کی خدمات بھی حاصل کی گئیں..... بڑی مشکل سے دونوں حضرات جھومتے جھامتے نشے میں دھت ڈائس تک آئے..... ان میں سے ایک صاحب نے جوتا اتارنا مناسب نہ سمجھا اس لئے پیر لٹکا کر کنارے پر ہی بیٹھ گئے۔ دوسرے حضرت مجھے گھورتے رہے پھر اچانک انہوں نے جھک کر نہایت ادب سے مجھے سلام کیا اور اجازت لے کر میرے قریب ہی بیٹھ گئے۔

سیکرٹری صاحب نے کھڑے ہو کر ارشاد فرمایا..... "حضرت آپ کو یہ سن کر بڑی خوشی ہوگی کہ آپ کے محبوب شعراء حضرت جہاز اور حضرت مجال تشریف لے آئے ہیں۔ اب مشاعرے کی باقاعدہ کارروائی شروع ہوتی ہے"۔

سیکرٹری صاحب کے اشارہ کرنے پر معلوم ہوا کہ میرے قریب بیٹھے ہوئے بزرگ حضرت جہاز ہیں۔

مشاعرہ دوبارہ شروع ہوگیا۔

"صدر صاحب" جہاز صاحب نے میری طرف جھک کر آہستہ سے کہا۔

"فرمایئے"۔

"سلاما لیکم" جہاز صاحب نے اپنی پیشانی پر پورا ہاتھ رکھ کر کہا۔

"واعلیکم السلام" میں نے اخلاقاً دانت نکال دیئے۔

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد جہاز صاحب پھر چونکے۔

"صدر صاحب"

"فرمایئے"

"سلاما لیکم"

میں نے مسکرا کر سر ہلا دیا.....

"آپ سلام کا جواب نہیں دیتے" جہاز صاحب بولے۔

"واعلیکم السلام" میں نے اپنی بداخلاقی پر شرما کر کہا۔

تھوڑی دیر تک جہاز صاحب اپنے مخصوص انداز میں شعروں کی داد دیتے رہے اس کے بعد پھر مجھ سے مخاطب ہوئے۔

"صدر صاحب"

"فرمایئے"

"میں آج کی رات خود کو بیوہ محسوس کر رہا ہوں"۔

میں نے پھر دانت نکال دیئے۔

"آپ بھی ہنستے ہیں..... میں آپ کو گولی مار دوں گا..... ٹھائیں"

جہاز صاحب نے بائیں ہاتھ کی کلمے کی انگلی پھیلا کر اور انگوٹھے میں دائیں ہاتھ کی کلمے کی انگلی پھنسا کر بندوق چلائی۔

"صدر صاحب"

"جی"

"ٹھائیں"

ایک شاعر پڑھ کر اٹھ ہی رہا تھا کہ جہاز صاحب نے اسے بھی اپنی انگلیوں کی بندوق سے شہید کر دیا۔ اور پھر یک بیک سارے مجمع پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ جب انہیں اچھی طرح سے اطمینان ہو گیا کہ اب ایک بھی متنفس زندہ نہیں رہا تو وہ مجال صاحب کی طرف متوجہ ہوئے۔

"مجال اے مجال ـــ جناب صدر میرے باپ کے والد صاحب ہیں"

کہہ کر جہاز صاحب میرے ہاتھ چومنے لگے۔ اس کے بعد جب انہوں نے منہ چومنے کی کوشش کی تو میں بوکھلا کر پیچھے ہٹ گیا۔

"خدا کی قسم صدر صاحب دانت نہیں کاٹوں گا..... اجی بس..... اجی بس..... واہ میری جان" میں بری طرح جھینپ رہا تھا۔ وہ تو کہئے سیکرٹری صاحب نے موقعے کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے فوراً جہاز صاحب کے نام کا اعلان کر دیا ورنہ معلوم نہیں کیا ہوتا۔

جہاز صاحب مائیک پر پہنچے۔ تھوڑی دیر تک بیٹھے انگلی نچاتے رہے۔ پھر نجانے کیا خیال آیا کہ کھڑے ہو گئے۔ مجمع نے شور مچانا شروع کر دیا..... آپ دو تین بار لڑکھڑائے اس کے بعد کہنا شروع کیا۔

"بھائیو آپ سب میرے باپ کے بھائی صاحب ہیں..... دیکھئے..... میں آپ کو سنانے جا رہا ہوں....." پھر ان کے انداز سے ایسا معلوم ہوا جیسے پیشواز تلاش کر رہے

ہوں۔

"جہاز صاحب بیٹھ کر پڑھئے" سیکرٹری صاحب نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

"جائیے نہیں پڑھتا" جہاز صاحب روٹھ کر اپنی جگہ پر آ بیٹھے۔

"ارے ارے جہاز صاحب" متعدد آوازیں آئیں۔

"نہیں نہیں صاحب، آپ ہی پڑھ لیجئے" جہاز صاحب سیکرٹری سے جھلا کر بولے۔

مجمع نے تھوڑی دیر صبر کیا اس کے بعد "مجال صاحب مجال صاحب" کی آواز بلند ہونے لگیں۔

سیکرٹری نے بھی دانشمندی سے کام لے کر "مجال صاحب" کے نام کا اعلان کر دیا۔

مجال صاحب پڑھنے بیٹھے ہی تھے کہ جہاز صاحب کو پھر تاؤ آ گیا۔

"مجال تمہاری اتنی جرات..... میں تم سے بڑا شاعر ہوں..... پہلے میں پڑھوں گا" جہاز اٹھتے ہوئے بولے۔

"کیا بکتے ہو..... لونڈے ہو" مجال صاحب کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اپنے حلقوں سے ابل پڑیں۔

جہاز صاحب مجال صاحب کو پرے دھکیل کر مائیک کے سامنے بیٹھ گئے۔

مجال صاحب نے انہیں ڈائس کے نیچے پھینک دیا اور مضبوطی سے پکڑ کر پڑھنے لگے۔ اب کی جو تاؤ آیا جہاز صاحب کو تو مجال صاحب کے سر پر ایک عدد چانٹا تصنیف کر دیا..... بس پھر کیا تھا ادھر ڈائس پر یہ دونوں شاعر گتھ گئے اور ادھر مجمع میں بھگدڑ مچ گئی..... میری جو شامت آئی تو ان دونوں حضرات کو الگ کرنے لگا..... اتنے

میں ایک غنڈہ ڈائس پر چڑھ آیا اور مجھے ایک طرف دھکیل کر بولا۔ "ابے تو کیوں بیچ میں بولتا ہے"

پھر اس نے دونوں ہاتھ پھیلائے اور قدرے جھکتے ہوئے اچھل اچھل کر کہنا شروع کیا۔

"واہ بیٹا..... ذرا گھوم کے..... ابے مار دے ٹانگ..... ٹانگ تھام کے الٹ جا ..... ابے بائیں سے..... ہاں..... شاباش..... دھت سالے کی نہیں تو"

مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ پھر کیا ہوا..... البتہ تھوڑی دیر بعد ویٹنگ روم میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ جوتے کی دوکان تک ننگے پیر کیونکر جاؤں۔

میں اس سے ملا

اداس ہوتا ہوں تو اناناس کے مربے کی تلاش ہوتی ہے نہ ملے تو پھر خناس، آج تک یہ بات سمجھ میں نہ آسکی کہ اداسی اور اناناس کے مربے میں کیا رشتہ ہے اور اگر یہ نہ ملے تو خناس کیوں؟

بہرحال یہ خناس بعض اوقات بڑی مشکلات میں مبتلا کر دیتا ہے..... غالباً ۱۹۴۰ء کی بات ہے.....

بمبئی میں تھا اور اس دن بہت اداس تھا۔ معلوم نہیں کیوں، اناناس کا خیال آتے ہی ایک فلمی اداکارہ یاد آئی اور میں چل پڑا انٹرویو کے لئے۔.....

ان دنوں یہی مشغلہ تھا۔ فلم ایکٹرسوں سے ملتا اور ان ملاقاتوں کی داستان لکھ کر ایک کپ چائے کے عوض کسی ایڈیٹر کی نذر کر دیتا۔

ہاں تو میں اس سے ملا۔ ملنے کے لئے اس قدر بے چین تھا کہ وقت سے آدھا گھنٹہ پہلے ہی اس کی..... رہائش پر پہنچ گیا۔ جب اس کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو وہ خاص پرائیویٹ حالت میں نظر آئی۔

ایک ٹائپ رائٹر سر پر رکھے میز پر کھڑی گنگنا رہی تھی۔

مجھے دیکھ کر میز سے اتری اور آہستہ آہستہ میری طرف بڑھنے لگی۔ "اوہ تم آگئے!" کہتے ہوئے اس نے ٹائپ رائٹر میرے سر پر دے مارا..... پھر خود اپنا سر تھام کر بیٹھ گئی اور لگی چیخ چیخ کر رونے۔ جب خوب سا رو چکی تو ہچکیاں لیتی ہوئی بولی۔

"آپ، آپ کون ہیں!"

"جی میں انٹرویو کے لئے حاضر ہوا ہوں!" میں نے رومال سے پیشانی کا خون پونچھتے ہوئے کہا۔

"ارے توبہ. میں آپ کو ہیرو سمجھی تھی!"

"ہیرو!"

"جی ہاں میں ریہرسل کر رہی تھی۔ معاف کیجئے گا!"

"کوئی بات نہیں!" میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

"تشریف رکھئے ......"

"شکریہ!"

وہ بے حد سیدھی سادی معلوم ہوتی تھی. چونکہ اس کے کپڑوں سے ہلدی اور دھنیااور سرسوں کے تیل کی بو آ رہی تھی. اس لئے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ امور خانہ داری میں بھی بے حد دلچسپی لیتی ہے!

میں اس کی خوش اخلاقی پر عش عش کرنے کا ارادہ ترک کر کے اصل موضوع پر آ گیا۔

"یہ تو آپ جانتی ہی ہیں کہ میں کس لئے حاضر ہوا ہوں۔" میں نے کہا

"جی بہت اچھی طرح ..... آپ سوالات کیجئے۔ لیکن یہ بتا دینا ضروری سمجھتی ہوں کہ میں الجبرا میں ہمیشہ کمزور رہی ہوں۔"

"کوئی بات نہیں، میں ارتھمیٹک کے سوال کروں گا۔ آپ یہ بتائیے اگر "ا" ایک کام کو پانچ دن میں کرتا ہے تو "ب" جس کے کام کی رفتار پانچ سو میل فی گھنٹہ ہے "ا" کے ساتھ مل کر کتنے دنوں میں کرے گا جب کہ "ا" کے کام کی رفتار صفر ہے۔"

وہ تھوڑی دیر سوچ کر بولی "نہ میں "ا" کو جانتی ہوں اور نہ "ب" کو۔ کام اگر سیٹھ کے گھر ہوتا تو رات بھر میں ختم ہو جائے گا اور اگر کام کا تعلق ڈائریکٹر

سے ہے تو کئی فلموں میں ایکسٹرا کی حیثیت سے کام کرنا پڑے گا!"

"ویری گڈ" میں تقریباً اچھلتا ہوا بولا تھا یا بولتا ہوا اچھلا تھا۔ اچھی طرح یاد نہیں۔

"اور کچھ؟" اس نے سوال کیا۔

"آپ فلمی دنیا میں کس طرح آئیں؟"

"میں غالباً. پہلے بذریعہ ٹرین آئی. پھر وکٹوریا پر بیٹھی۔ اس کے بعد چھوٹو بھائی کھٹ کھٹ بھائی کے ذریعے ڈائریکٹر بیکار تک پہنچی۔"

"آپ کی پہلی فلم کا نام"

"بیمار الو!"

"پہلی بار آپ نے کیمرے کے سامنے کیا محسوس کیا؟"

"سیٹیاں، تالیاں اور گالیاں"

"آپ اتنی خوبصورت کیوں ہیں!" میں نے دانتوں میں انگلی دبا کر شرماتے ہوئے پوچھا۔

"جی ..... میں روز صبح دلکش صابن کھاتی ہوں!"

"ایک بات اور پوچھوں، آپ برا تو نہیں مانیں گی!"

"شوق سے پوچھئے!"

"آپ نے اتنی شادیاں کیوں کی ہیں؟"

"بات دراصل یہ ہے ....." وہ کچھ سوچتی ہوئی بولی "مجھے کتوں سے زیادہ شوہر پسند ہیں۔"

"آخر کیوں۔"

"کتے بھونکتے بہت ہیں اور کبھی کبھی کاٹ بھی لیتے ہیں!"

"آپ کہاں پیدا ہوئی تھیں"

"ہسپتال میں!"

"اس وقت آپ کی عمر کیا ہے؟"

"انیس سال"

"کیا آپ کسی شریف خاندان سے تعلق رکھتی ہیں؟"

"جی ہاں، اب ایک شریف خاندان سے تعلق رکھتی ہوں، کیونکہ میرا بینک بیلنس شرافت کی حدود میں داخل ہو گیا ہے!"

"آپ کے والدین زندہ ہیں؟"

"جی ہاں!"

"وہ کیا کرتے ہیں؟"

"بچے پیدا کرتے ہیں!"

"آپ کے کتنے بچے ہیں؟"

"سولہ عدد!"

"اوہ۔!" میں مطمئن ہو گیا۔

تھوڑی دیر تک ہم دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ پھر وہ بولی "کچھ اور پوچھنا ہے آپ کو!"

"آپ کا پہلا بچہ کس عمر میں پیدا ہوا تھا؟"

"جب میں انیس سال کی تھی!"

"دوسرا بچہ!"

"جب میں انیس سال کی تھی!"

"تیسرا بچہ!"

"جب میں انیس سال کی تھی!"

"چوتھا بچہ!"

"چوتھا ہی نہیں بلکہ سولھواں بھی انیس ہی سال کی عمر میں پیدا ہوا تھا!"

"خوب، اچھا آپ کی نانی محترمہ کا کیا نام ہے؟"

"شریف خواتین کے نام غیر مردوں کو نہیں بتائے جاتے۔"

"اوہ معاف کیجئے گا!" میں نے نادم ہو کر کہا اور اس نے مجھے تہہ دل سے معاف کر دیا۔

"آپ کے بچے آپ کو کیا کہتے ہیں!" میں نے پوچھا۔

"آپ" جواب ملا۔

"ممی کیوں نہیں کہتے!"

"سمجھدار بچے ہیں!"

"فلمی دنیا میں آنے سے پہلے آپ کیا کرتی تھیں!"

"یاد نہیں!"

"پھر بھی!"

"غالباً محبت کرتی تھی!"

"ترکاریوں میں آپ کو کون سی ترکاری پسند ہے!"

"جسے چھیلنا نہ پڑے!"

"آپ کو کبھی کبھی کھانسی بھی آتی ہے؟"

"جی ہاں!"

"آپ کا سر تو نہیں چکراتا!"

"جی ہاں، کبھی کبھی چکراتا تو ہے۔"

"آنکھوں کے سامنے نیلی نیلی چنگاریاں تو نہیں اڑتیں۔"

"اکثر اڑتی ہیں!"

"کبھی سفید...... مطلب یہ کہ کبھی سفید آم کھایا ہے، آپ نے!"

"جی ہاں اکثر کھانے کا اتفاق ہوا ہے!"

"اور لنگڑا!"

"وہ بھی کھایا ہے!"

"آپ کو ادب سے بھی کچھ دلچسپی ہے؟"

"جی ہاں، سیٹھ سے لے کر ٹرالی چلانے والے لڑکے تک کا ادب کرتی ہوں!"

"آپ کو ڈائریکٹروں میں کون سا سب سے زیادہ پسند ہے!"

"وہ جسے میرے بچوں کی تعداد معلوم نہ ہو!"

"بہت خوب، اب میں جیومیٹری کے کچھ سوال کرنا چاہتا ہوں۔"

"شوق سے!"

"ایک اور صرف ایک دائرہ تین ایسے نقطوں سے گزر سکتا ہے، جو ایک ہی خط مستقیم پر نہیں ہے، یہ کس مسئلے کا دعویٰ عام ہے۔"

"میں اس سوال کا جواب نہیں دینا چاہتی، کیونکہ ابھی میری عمر چوبیس سال سے کم ہے، کوئی دوسرا سوال پوچھئے شاید میری جیومیٹری بھی کمزور ہے۔"

"بچپن میں آپ کن چیزوں کی شائق تھیں!"

"زیادہ تر پتنگ اڑایا کرتی تھی۔"

"صرف اڑاتی تھیں یا لڑاتی بھی تھیں؟"

"میں اس سوال کا جواب نہیں دے سکتی!"

"اوہ، لیکن یہی سوال تو انٹرویو کا حاصل ہے۔"

"مجبوری ہے!"

"میں ہاتھ جوڑتا ہوں، اس سوال کا جواب ضرور دیجئے!"

"نہیں صاحب! واہ اچھی رہی!"

"خیر آپ کی مرضی!" میں نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔

"ارے ...... ارے ...... آپ رو رہے ہیں!"

"رو لینے دیجئے مجھے!"

"بس اب خدا کے لئے چپ ہو جائیے ...... اچھا سنئے ...... میں بتاتی

ہوں!"

"نہیں، نہیں، مت بتائیے! مجھے رو رو کر مر جانے دیجئے!"

"شیطان کے کان بہرے ......!"

"شیطان کے کان بہرے!" میں خوشی سے چیخا!

"جی ہاں۔!"

"ایک بار پھر کہئے!"

"کاش آپ زندگی بھر دہراتی رہیں ...... اور میں سنتا رہوں!"

"کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں!"

وہ خوش ہو کر بولی۔

"صدفی صد سچ!"

"کچھ اور پوچھنا ہے آپ کو؟"

"صرف ایک سوال، فی الحال آپ کا شوہر کون ہے؟"

"آج کل تو کوئی بھی نہیں ہے!"

"کیا میں اپنی خدمات پیش کر سکتا ہوں!"

"آپ کو شرم نہیں آتی، ایسی باتیں کرتے ہوئے!" اس نے دانتوں میں انگلی دبا کر پلکیں جھکا لیں۔

"معافی چاہتا ہوں!"

"خیر، یہ بتائیے آپ کے پاس کتنی کاریں ہیں!"

"کاریں ...... کک ...... کاریں!" میں نے آہستہ آہستہ اٹھنا شروع کیا۔

"جی ہاں کاریں!"

"جج جی بتاتا ہوں، وہ کاریں!"

اب میں دروازے تک پہنچ چکا تھا۔ جیسے ہی اس نے مصافحہ کے لئے ہاتھ

بڑھاپا، میں نے سڑک پر چھلانگ لگا دی اور ایک کار دندناتی ہوئی مجھ پر سے گزر گئی۔

حصہ نظم

انتخاب

ابن صفی

جو کہہ گئے وہ ٹھہرا ہمارا فن اسرار
جو کہہ نہ پائے نہ جانے وہ کیا چیز ہوتی

مدتوں ذہن میں گونجوں گا سوالوں کی طرح
تجھ کو یاد آؤں گا گزرے ہوئے سالوں کی طرح
ڈوب جائے گا جو کسی روز یہ خورشیدِ انا
مجھ کو دہراؤ گے محفل میں مثالوں کی طرح

○

جانے کیسی یاد کا پتھر بیتے دنوں سے آیا تھا
شیش محل خوابوں کے سارے پل میں چکنا چور ہوئے
آس پڑوس کے لوگ بھی تم کو پہچانیں تو بات بھی ہے
جگ بیتی لکھ لکھ صفی جی یوں تو بہت مشہور ہوئے

غزل

کچھ بھی تو اپنے پاس نہیں جزمتاعِ جاں
اب اس سے بڑھ کے اور بھی کوئی ہے امتحاں
لکھنے کو لکھ رہے ہیں غضب کی کہانیاں
لیکن نہ لکھ سکے کبھی اپنی ہی داستاں
دل سے دماغ و حلقۂ عرفاں سے دار تک
ہم خود کو ڈھونڈتے ہوئے پہنچے کہاں کہاں
اس بےوفا پہ بس نہیں چلتا تو کیا ہوا
اُڑتی رہیں گی اپنے گریباں کی دھجیاں
ہم خود ہی کرتے رہتے ہیں فتنوں کی پرورش
آتی نہیں ہے کوئی بَلا ہم پہ ناگہاں!
جنگل میں بھیڑیوں سے سوا کون معتبر
جس کے سپرد کیجئے اقلیمِ جسم و جاں

غزل

روح پر چھائیں ہے پرچھائیں سے کب پیار ہوا
جسم ہی تو وہ حقیقت ہے کہ دلدار ہوا
کوئی صورت بھی تو اس جیسی نہیں یاد آتی
کیسا لمحہ تھا کہ اک عمر کا آزار ہوا
تجھ سے پہلے تو بہت سادہ و معصوم تھا دل
تجھ سے بچھڑا تو کئی بار گنہگار ہوا
کیا قیامت ہے کہ جس نے مری دنیا لوٹی
وہ بھی اقرارِ محبت کا طلبگار ہوا
نغمۂ صبح تو چھیڑا تھا مگر کیا کیجیے
سازِ احساس کا ہر تار شبِ تار ہوا
قدو گیسو ہی بنے اپنے لئے دارو رسن!
کوئی منصور کبھی یوں بھی سرے دار ہوا
سالہا سال میں تکمیل کو پہنچی یہ غزل
دل وحشی کبھی مائل کبھی بیزار ہوا!!

غزل

راہِ طلب میں کون کسی کا اپنے بھی بیگانے ہیں
چاند سے مکھڑے رشکِ غزالاں سب جانے پہچانے ہیں
تنہائی ہی تنہائی ہے کیسے کہیں کیسے سمجھائیں
چشم و لب و رُخسار کی تہ میں رُوحوں کے ویرانے ہیں
اُف یہ تلاشِ حسن و حقیقت کس جا ٹھہریں جائیں کہاں
صحنِ چمن میں پھول کھلے ہیں صحرا میں دیوانے ہیں
ہم کو سہارے کیا راس آئیں اپنا سہارا ہیں ہم آپ
خود ہی صحرا خود ہی دوانے شمع نفس پروانے ہیں
اپنے وجود کی مستی ہے ہم رندوں کے احوال نہ پوچھ
قدم قدم پہ چھیڑ خرد سے نفس نفس میخانے ہیں
بالآخر تھک ہار کے یارو ہم نے بھی تسلیم کیا
اپنی ذات سے عشق ہے سچا باقی سب افسانے ہیں

غزل

لَب و رخسار و جبیں سے ملئے
جی نہیں بھرتا کہیں سے ملئے

یوں نہ اس دل کے مکیں سے ملئے
آسماں بن کے زمیں سے ملئے

گھٹ کے رہ جاتی ہے رسوائی تک
کیا کسی پردہ نشیں سے ملئے

جی نہ بہلے رمِ آہو سے تو پھر
طائر سدرہ نشیں سے ملئے

بجھ گیا دل تو خرابی ہو گی
پھر کسی شعلہ جبیں سے ملئے

غزل

وہ جس کا سایہ گھنا گھنا ہے
بہت کڑی دھوپ جھیلتا ہے

ابھی تو میرے ہی لب ہلے تھے
مگر یہ کس شخص کی صدا ہے

اگر میں چپ ہوں تو سوچتا ہوں
کوئی تو پوچھے کہ بات کیا ہے

مرے لبوں پر یہ مسکراہٹ
مگر جو سینے میں درد بسا ہے

کوئی شکایت نہیں کسی سے
کہ شوق اپنا بھی نارسا ہے

اسی جگہ کیوں بھٹک رہا ہوں
اگر یہی گھر کا راستہ ہے

ابھی سے کیوں شام ہو رہی ہے
ابھی تو جینے کا حوصلہ ہے

نظم

ابھی تو دور سے آئی تھی بنسری کی صدا
دکھوں میں ڈوبی ہوئی درد میں نہائی ہوئی
نہ جانے کان میں کیا کہہ گئی کہ یاد آئی!
کہانی میری کہی اور تری بھلائی ہوئی
فضا میں تیرتی قازوں نے جس کو دہرایا
یہ بازگشت تھی گویا سنی سنائی ہوئی
یہ چاہتا ہوں کہ بجھ جائے پر نہیں بجھتی
بھڑک اٹھی ہے جو آگ اب تری لگائی ہوئی

☆

جگا دیا تھا جسے تیرے اک تبسم نے!!
وہ آرزو میری راتوں کی نیند لے بیٹھی
فریبِ بادہ و ساغر بھی جس پہ چل نہ سکا
جو بارِ شاہد و نغمہ سے بھی تو دب نہ سکی
تسلیاں جسے آسودگی نہ دے پائیں
جو ہائے اب کسی پہلو سکوں نہیں لیتی
جگائے جاتی ہے پیہم جگائے جاتی ہے
خدا گواہ ہے کل سے پلک نہیں جھپکی

☆

یہ جانتا ہوں کہ دھوکا ہے پر نہ جانے کیوں
ہر اک صدا تری آہٹ ہی بن کے آتی ہے
کبھی فضا میں لرزتی ہے چوڑیوں کی کھنک
کبھی ہواؤں میں پازیب گنگناتی ہے
کبھی جھنجھوڑتی ہے بوئے پیرہن کی لپٹ
تری صدا کبھی کانوں میں کپکپاتی ہے
کبھی وہ نغموں سے بھرپور تیری سسکاری
مرے خیال کے تاروں کو چھیڑ جاتی ہے

☆

اسی اداس خلا میں نظر جمائے ہوئے
کبھی تو بھول گیا ہوں میں اپنی تنہائی

کچھ ایسا جان پڑا ہے ترا نڈھال بدن
میرے قریب ہی لینے لگا ہے انگڑائی
مرے لبوں کو دہکتے ہوئے لبوں کا گداز
جھجک رہا ہے دکھاتے ہوئے مسیحائی

☆

سجیلے گیسوؤں میں کسمسائی سی گردن
دھڑکتے سینے پہ میرے ذرا ڈھلک آئی
بھرے بھرے سے سلگتے ہوئے حسین رخسار
پلاتے ہیں میرے ہونٹوں کو اپنی چھلکائی
نشے میں ڈوبی ہوئی اف وہ ادھ کھلی آنکھیں
لچکتی بانہوں کی اللہ رے وہ رعنائی

☆

مگر یہ کیف میں ڈوبا ہوا طلسم خیال
غم حیات کی آہٹ سے ٹوٹ جاتا ہے
انوکھے رنگ دکھاتا ہوا یہی فانوس
اندھیری رات سے ٹکرا کے ٹوٹ جاتا ہے

غزل

چاہت کی یہی تو ابتدا ہے
دل میرا جو تجھ سے بھر گیا ہے
ہر شخص ہے جستجو میں اپنی
یاں کون کسی کا آشنا ہے
گزرا ہوا حادثہ بھی یارو
مڑ مڑ کے ادھر ہی دیکھتا ہے
کب تک سئے جائیں گے گریباں
وحشت کی ابھی تو ابتدا ہے
سینے میں چبھن سی ہو رہی ہے
کانٹا کسی کی یاد کا لگا ہے
جو کچھ نہ طلب کرے کسی سے
محبوب وہی ہے، دلربا ہے
کیا غم، شبِ غم کی تیرگی کا
دل بجھ کے چراغ ہو گیا ہے

غزل

کچھ تو تعلق کچھ تو لگاؤ
میرے دشمن ہی کہلاؤ
دل سا کھلونا ہاتھ آیا ہے
کھیلو، توڑو، جی بہلاؤ
کل اغیار میں بیٹھے، تھے تم
ہاں! ہاں! کوئی بات بناؤ
کون ہے ہم سا چاہنے والا
اتنا بھی اب دل نہ دکھاؤ

ق

حسن تھا جب مستور حیا میں
عشق تھا خونِ دل کا رچاؤ
حسن بنا جب بہتی گنگا
عشق ہوا کاغذ کی ناؤ!
شب بھر کتنی راتیں گزریں
حضرتِ دل اب ہوش میں آؤ

غزل

چھلکتی آئے کہ اپنی طلب سے بھی کم آئے
ہمارے سامنے ساقی بہ ساغرِ جم آئے
فروغِ آتشِ گل ہی چمن کی ٹھنڈک ہے
سلگتی چیختی راتوں کو بھی تو شبنم آئے
بس ایک ہم ہی لئے جائیں درسِ عجز و نیاز
کبھی تو اکڑی ہوئی گردنوں میں بھی خم آئے
جو کارواں میں رہے میرِ کارواں کے قریب
نہ جانے کیوں وہ پلٹ آئے اور برہم آئے
نگارِ صبح سے پوچھیں گے، شب گزرنے دو
کہ ظلمتوں سے الجھ کر وہ آئی یا ہم آئے
عجیب بات ہے، کیچڑ میں لہلہائے کنول
پھٹے پرانے سے جسموں پہ سج کے ریشم آئے
مسیح کون بنے سارے ہاتھ آلودہ
لہولہان ہے دھرتی کہاں سے مرہم آئے

التجا بحضور سرور کائنات
صلی اللہ علیہ وسلم

میرے آقا میں کس منہ سے در پر ترے حاضری دوں
میرے ماتھے پہ اب تک نشانِ عبادت نہیں
ایک بھی نیک عادت نہیں
میری جھولی گناہوں سے پُر ہے
میرے ہاتھوں کی آلودگی باعثِ شرم و غیرت بنی
میرے آقا میں کس منہ سے در پر ترے حاضری دوں
پھر بھی آقا مرے پھر بھی مولا مرے
تیرے در کے سوا اور جاؤں کہاں ؟
ہو اجازت مجھے حاضری کی عطا
میرے آقا میں نادم ہوں اپنی بدعادات پر

غزل

عشق عرفان کی ابتدا ہے
حسن منزل نہیں راستہ ہے
ذرے ذرے میں سورج ہے پنہاں
تُو افق میں کِسے ڈھونڈتا ہے
پھول کی زندگی ایک دن کی
جانے کس بات پر پھولتا ہے
جب سے تم مہرباں ہو گئے ہو
دل کو دھڑکا سا اک لگ گیا ہے
علم و حکمت نے وہ گُل کھلائے
اب تو وحشت ہی کا آسرا ہے
درد جو مل گیا ہے دوا سے
اس نئے درد کی کیا دوا ہے
کل یہی راستہ بن نہ جائے
آج جو صرف اِک نقش پا ہے

سلام

بانیٔ آبلہ پائی کو سلام
کیجئے دستِ حنائی کو سلام

اس نے بھی آگ لگائی کیا کیا
مے کی اندوہ ربائی کو سلام

پیرہن بھی تو نہ چھوڑے تن پر
عقل کی عقدہ کشائی کو سلام

کان بجنے لگے تاثیر ہے خوب
آپ کی نغمہ سرائی کو سلام

راہِ دشوار میں دشنام ملیں
دور سے راہنمائی کو سلام

غزل

گر وقت کڑی دھوپ ہی بن جائے تو کیا ہو
وہ پھول سا چہرہ بھی جو کمھلائے تو کیا ہو

موجِ مئے گلرنگ کی لرزش ہے کہ رفتار
اے بادہ وشو یوں جو چھلک جائے تو کیا ہو

ڈسنے کو چڑھی آتی ہے ناگن سی شبِ تار
صندل سا بدن بھی جو نہ یاد آئے تو کیا ہو

اس بت کی رگِ جاں کے قریں بھی تو وہی ہے
واعظ کی سمجھ میں جو یہ آ جائے تو کیا ہو

انگڑائی ہے یا جام سے ابلی ہوئی صہبا
ایسے میں کوئی پی کے بہک جائے تو کیا ہو

توبہ بھی کروں اور گھٹائیں بھی نہ اٹھیں
پرزلفِ سیہ ابر سی لہرائے تو کیا ہو

اے ماہ وشو، گلبدنو، عشوہ طرازو
تم کو بھی کوئی گر یونہی ترسائے تو کیا ہو

غنودگی

بجھی بجھی سی ہیں قندیل ہائے بزمِ دماغ
فسردگی نے امنگوں کا ساز چھین لیا
تڑپ کے سرد ہوئی گھنگھروؤں کی نرم صدا
سیاہیوں میں ستارے سے رقص کرتے ہیں
کبھی شعور میں گھلتے کبھی ابھرتے ہیں
کبھی فضا میں لرزتے ہیں نقرئی آنچل
کبھی زمیں پہ پھسلتے ہیں سیمگوں بادل
سیاہیاں کسی گوشے سے دوڑ آتی ہیں
تجلیات سے ٹکرا کے لوٹ جاتی ہیں
سکوں بدوش ہے بکھرے ہوئے خیالوں کا
ربابِ ذہن پہ ہیجان آفریں نغمہ
خلا میں ڈوب گئی نغمۂ شعور کی لے
کہ لاشعور کے ہونٹوں پہ تھرتھری سی ہے
محال ہے کہ ملے شب میں زندگی کا سراغ

غزل

یہی ہے خاک نشینوں کی زندگی کی دلیل
قضا سے دور ہے ذروں کا انکسار جمیل
وہی ہے ساز، ابھارے جو ڈوبتی نبضیں!
وہی گیت نفس میں جو ہو سکے تحلیل
دکھائی دی تھی جہاں سے گناہ کی منزل!
وہیں ہوئی تھی دلِ ناصبور کی تشکیل
سمجھ میں آئے گی تفسیرِ زندگی کیا خاک
کہ حرفِ شوق ہے اجمال بےدلی تفصیل
یہ شاہراہِ محبت ہے، آگہی کیسی!
بجھا سکو تو بجھا دو، شعور کی قندیل!
صدائے نالہ بھی آتی ہے ہمرکاب نسیم
نہ ہو سکی ہے نہ ہو گی بہار کی تکمیل
ہزار زیست ہو پائندہ تر مگر اسرار
اجل نہ ہو تو بنے کون بارِ غم کا کفیل!

ماں!

اِک بچہ
اپنی ماں سے بچھڑ گیا ہے
اس میلے میں
اب کیا ہو گا؟
کون اسے گھر لے جائے گا
حیراں حیراں دیکھ رہا ہے
چاروں طرف چہرے ہی چہرے
دھندلے چہرے
کیا یہ، اس کو پہچانیں گے؟
کیا یہ، اسے گھر تک پہنچا دیں گے؟
کوئی نہیں
سب اندیکھے انجانے ہیں
سہما سہما چیخ رہا ہے
ماں!
ماں!!
ماں!!!

غزل

ذہن سے دل کا بار اترا ہے
پیرہن تار تار اترا ہے
ڈوب جانے کی لذتیں مت پوچھ
کون ایسے میں پار اترا ہے
ترکِ مئے کر کے بھی بہت پچھتائے
مدتوں میں خمار اترا ہے
دیکھ کر میرا دشتِ تنہائی
رنگِ روئے بہار اترا ہے
پچھلی شب چاند میرے ساغر میں
پے بہ پے بار بار اترا ہے
پیاسے ہونٹوں کی بےخودی کے طفیل
پتھروں میں بھی پیار اترا ہے
دل علیہ السلام پر لوگو
مصحف روئے یار اترا ہے

غزل

نگارِ شوخ کی بےباکیوں سے کیا حاصل
جو دل اداس ہو، رنگینیوں سے کیا حاصل
نہ اب وہ رات نہ وہ حسنِ گرمئ محفل
چراغِ صبح 'تنک تابیوں سے کیا حاصل
فسُردگی کی قسم عزم لامکاں تک ہے
نہ پوچھ دوست کہ تنہائیوں سے کیا حاصل
لہو لہو ہے افق شام مضمحل سی ہے
تم ہی بتاؤ کہ ان سرخیوں سے کیا حاصل
جو بوئے گل پہ نہ ہو ان کی دسترس اے دل
چمن میں ایسی بھی پابندیوں سے کیا حاصل

غزل

گر رہا ہے تو کسی اور طرح خود کو سنبھال!
ہاتھ یوں بھی تو نہ پھیلے کہ بنے دستِ سوال
گھر بنانا بھی اسیری ہی تو کہلائے گا
خود کو آزاد سمجھتا ہے تو یہ روگ نہ پال
مہ جبینوں نے کسی کام کا چھوڑا نہ ہمیں
چاند چڑھتا ہے تو بن جاتا ہے جی کا جنجال
تختۂ دار ہی بن جائیں گے تیرے شب و روز
دل کی باتوں کو کبھی عقل کے سانچے میں نہ ڈھال
روح کو جسم کے ویرانے میں گم رہنے دے
جی بہلنے کے لئے کم تو نہیں ہیں خدوخال
اس سن و سال پہ نازاں ہو مگر سوچو تو
وقت کے پاؤں کی زنجیر نہیں ہیں مہ و سال
تم سمجھتے ہو کہ ہے تختۂ گل میرا جہاں
وہ گھٹن ہے کہ مجھے سانس بھی لینا ہے محال

ساقی نامہ

اٹھی مغرب سے کالی کالی گھٹا
توبہ کیونکر نہ ٹوٹے آج بھلا

ساقیٔ سیم تن اِدھر تو آ
سن تو کیا کہہ رہی ہے مست ہوا

کیسی سرگوشیاں ہیں موسم کی
ہائے ایسے میں برق کیوں چمکی

کیا اشارہ نہیں یہ پینے کا
کیا نہیں یہ پیام جینے کا

لا اِدھر لا شراب اے ساقی
تیز رو ہے شباب اے ساقی

لا پلا دے کہ لڑکھڑا کے تھمے
ورنہ جانے یہ کہاں جا کے تھمے

دے مجھے آج بادۂ گلفام
تاکہ بھُولے یہ تلخیٔ ایام

ہائے میں کیا کروں کہ یاد نہ آئے
کیا کروں میں کہ ابر و باد نہ آئے

یہ گھٹائیں، یہ ٹھنڈی ہوا
یہ ہواؤں میں کوئلوں کی صدا

ماضیٔ خفتہ کو جگاتی ہیں
سوئی یادوں کو چھیڑ جاتی ہیں

کیا زمانہ تھا، کیا زمانہ تھا
ہر زباں پر نیا ترانہ تھا

یہ زمیں تھی، بہار کا مخزن
زندگی کے کچھ اور ہی تھے چلن

پنگھٹوں پر حسین چہلیں تھیں
جگمگاتی تھی زندگی کی جبیں،

عصمتیں بےہراس پھرتی تھیں
برق ہائے ہوس نہ گرتی تھیں

بھوک سے آشنا نہ تھا انساں
زر اگلتی ہوئی زمیں تھی جواں

ہائے تہذیبِ نو کا دستِ ہوس
لے کے اٹھا نظام زر کا قفس

جھک گئی شرم سے سحر کی جبیں
لٹ گئی ہائے یہ کنواری زمیں

اس کے چہرے پہ مُردنی چھائی
اب لبوں میں کہاں مسیحائی

اس کے شانوں پہ چمنیوں کا دھواں
زلفِ عنبر فشاں ہوئی بےجاں

سبزہ زاروں کے مٹ گئے ہیں نشاں
اس کے سینے میں اب وہ بات کہاں

اس پہ دستِ ہوس نے ڈالے نیل
یہ مشینیں، ملیں ہیں جن کی دلیل

اُف یہ اندھیر ہائے یہ چتا
بطنِ گیتی سے غم ہوا پیدا

پنگھٹوں پر اداس تصویریں
جن پہ دستِ اَلم کی تحریریں

بھوک، افلاس، فاقہ ذہن علیل
اتنے عنوان ایک ہی تمثیل

عصمتیں لٹتی ہیں سرِ بازار
آدمیت ہوئی ذلیل و خوار

ساقیٔ لالہ رخ یہ جینا ہے
اب تو پینا لہو کا پینا ہے

اب گوارا نہیں عذاب مجھے
زہر دے اب نہ دے شراب مجھے

غزل

لہو سے خود کو سنوارے ہوئے ہیں سنگدلاں
صدف کی موت ہے زیبِ گلوئے ماہ وشاں

نہ کوہکن ہی رہا اور نہ خسروی باقی
ہماری راہ میں حائل ہے اب بھی سنگِ گراں

ہوا ہے پیرِ خرابات کا بھی نشہ ہرن
چلی ہے جب سے حرم میں ہوائے عشقِ بُتاں

نفس نفس میں فروزاں ہے مشعلِ جاں سوز
کیا ہے جب سے اسے منزلِ نظر کا نشاں

محبتیں تو سرِ راہ مل گئی ہوتیں
ہمارے ذہن پہ طاری تھا خودسری کا دھواں

جو رات آئی تو آہٹ دکھوں کی ملنے لگی
غموں کی راہ گزر ہے کہ ہے یہ کاہکشا ں

ابھی بھٹکتے رہو جسم و جاں کی وادی میں
تمہارے واسطے آئے کہاں سے سختِ رواں

غزل

بات ہی کیا تھی چلے آتے جو پل بھر کے لئے
یہ بھی اک عمر ہی ہو جاتی مرے گھر کے لئے

بتکدہ چھوڑ کے آئے تھے حرم میں اے شیخ
تو ہی انصاف سے کہہ دے اسی پتھر کے لئے

یوں تو ہیں خاک بسر عرش پہ رہتا ہے دماغ
اَوجِ شاہی نے قدم ہم سے قلندر کے لئے

کبھی آنسو، کبھی شبنم، کبھی بنتا ہے گہرُ
قطرہ بیتاب ہے اس درجہ سمندر کے لئے

پھول سے چہرے کی اشکوں نے بڑھا دی زینت
آخرش چاہئے شبنم بھی گلِ تَر کے لئے

تیرے کاشانے کی تعمیر کو کیا نذر کروں
میری تقدیر کا پتھر ہے ترے دَر کے لئے

تھیں زلیخائیں بہت یوسف ثانی تو بنا
کوئی امت نہ ملی دل سے پیمبر کے لئے

نوحہ

بس اتنی سی رُوداد ہے آدمی کی
کبھی رہنمائی، کبھی رہزنی کی

اندھیرا ازل سے ابَد تک اندھیرا
ذرا دیر کو ہے کرن روشنی کی

محبت کے دھوکے تو کھاتے رہے ہیں
کرم آپ کا، آپ نے دشمنی کی

تو ہنس لیں گے اپنے ہی احوال پر ہم
اگر کوئی صورت نہ نکلی خوشی کی

ہم اپنے ارادے سے کب آئے تھے یاں
تو پھر ہے یہ کیسی ہوس زندگی کی

ہے انساں کے سر میں دھماکوں کا سودا
خِرد تو فنا ہو چکی ہے کبھی کی

غزل

بہار گریۂ شبنم کا راز کیا جانے
یہ اس سے پوچھ کہ دیکھے ہوں جس نے ویرانے

شریکِ بزم ہوئی جب سے چشم ساقی بھی
ہر ایک جام سے چھلکے ہزار مے خانے

تمام عالمِ امکاں شراب خانہ ہے
یہ اور بات ہے زاہد سبو نہ پہچانے

نہ دیکھ اب مرے ہونٹوں پر مہرِ خاموشی
دیئے فریب ہزاروں تری تمنا نے

ہمیں تو ہے مۓ گلرنگ و گل رخاں سے غرض
بنائے کفر پڑی کس طرح خدا جانے

بس اتنا یاد ہے اسرار وقتِ مے نوشی
کسی کی یاد بھی آئی تھی مجھ کو سمجھانے

غزل

قفس کی داستاں ہے اور ہم ہیں
اشاروں کی زباں ہے اور ہم ہیں

کبھی دیکھا تھا ایسا بھی چراغاں
نشیمن کا دھواں ہے اور ہم ہیں

پئے مرہم ضروری ہے جراحت
صفِ نشتر زناں ہے اور ہم ہیں

کرم ہے یہ بھی میرِ کارواں کا
غبارِ کارواں ہے اور ہم ہیں

شمار زخم ہائے دل کہاں تک
حسابِ دوستاں ہے اور ہم ہیں

کہانی ختم ہوتی ہے نہ شب ہی
وہی معجز بیاں ہے اور ہم ہیں

ایک منظوم پریم کہانی

شکست طلسم

اے طلسمِ خیال کون آیا!

وہی بوٹا سا قد وہی رفتار
وہی الھڑ پنا وہی گفتار
کپکپاتے ہوئے لبوں پہ ہنسی
ہنستے ہنستے کلامِ زیرِ لبی
موتیوں کی قطار زیبِ گلو
پیراہن کی عجیب سی خوشبو
عارضوں پر وہ بالیوں کا رچاؤ
کتنا دلکش ہے ابروؤں کا تناؤ
شوخ سی ایک لٹ ہے ماتھے پر
پارۂ ابر جیسے وقتِ سحر
پیرہن جیسے لہلہائے چمن
بھیرویں کی الاپ ہے کہ بدن
وہ ہنسی اور وہ جسم کی ہلچل
جیسے لہروں میں ڈولتا ہو کنول

آخرش ٹوٹ ہی گیا وہ طلسم!

نہ وہ الھڑ پنا نہ وہ گفتار
کل سے خالا کو ہو گیا ہے بخار
میں نے ڈالا تھا مولیوں کا اچار
جس میں بالکل نہیں ہے تیل کی جھار

جانے کیا یہ تیل ہوتا ہے،
جانے کس شے کا میل ہوتا ہے،
پیلی سرسوں کا اب نصیب کہاں
وہائٹ آئل ہو کچھ عجیب بھی،
اب کہاں وہ کلامِ زیر لبی،
گالیوں پر ہے پیار کی شہری
"تم بہت تھڑدلے ہو احمق ہو
کان دھرتے نہیں جو بات کرو
جانے ہو کس قماش کے بندے
آدمی بھی ہو یا نرے رندے
بات کرتے ہو احمقوں کی سی
چال چلتے ہو بطخوں کی سی
بال کب سے نہیں ترشوائے
کوئی کہہ کہہ کے دانت منجھوائے
کیوں نظر آؤ اس طرح مجنون
گر پریس کر لیا کرو پتلون
بولنے پر جو آؤ، چاٹو کان
اور خموشی دکھائی دے خفقان،
اپنے فن پر بہت نہ اتراؤ
آدمی بن کے بھی تو دکھلاؤ
فن کو میں سر کی جوں سمجھتی ہوں
کیسے برداشت تم کو اب میں کروں،